سلسلۂ اشاعتِ تنظیمِ اسلامی نمبر ۳

تعارف
تنظیمِ اسلامی

☆

پس منظر

اور

اساسی نظریات

مرتب

ڈاکٹر اسرار احمد

تنظیم اسلامی، 67/اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور۔
فون 36293939-36316638-36366638 فیکس 36271241
www.tanzeem.org

ترتیب

- تقدیم 3
- حصہ اوّل 24
  - قراردادِ تاسیس 25
  - توضیحات 27
  - تقریر مولانا امین احسن اصلاحی 35
  - تقریر مولانا عبدالغفار حسن 45
  - مولانا اصلاحی کا الوداعی خطاب 55
  - تائید و تبصرہ 58
- حصہ دوم 61
  - عقائد یا بنیادی دینی تصورات 62
- حصہ سوم 76
  - فرائض دینی کا جامع تصور 78

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقدیم

تنظیم اسلامی اگرچہ تاحال ایک مختصر سے قافلے کی حیثیت رکھتی ہے' تاہم بحمد اللہ اس کا اجمالی تعارف' کسی نہ کسی درجہ میں' نہ صرف پاکستان کے طول وعرض بلکہ بیرونی ممالک میں بھی کم ازکم اردو بولنے والوں کی حد تک بہت وسیع پیمانے پر ہو چکا ہے۔ اندریں حالات ضرورت محسوس ہورہی تھی کہ اس کے اساسی نظریات' جو تاحال مختلف کتابچوں کی صورت میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں' انہیں افادۂ عام کے لیے یکجا کردیا جائے —— تاکہ ایک جانب کسی بھی نئے شخص کے لیے تنظیم کے مقاصد اور نظریات کے سمجھنے میں سہولت پیدا ہوجائے' اور دوسری جانب اس کے اہداف ومقاصد اور ہیئت تنظیمی کے ضمن میں جو ارتقائی عمل بروئے کار آیا ہے وہ بھی واضح اور معین ہوجائے۔ چنانچہ یہی پیش نظر کتاب کی اشاعت کا اصل مقصد ہے۔

☆☆☆

مختصر ترین الفاظ میں تنظیم اسلامی کی اجتماعی مساعی کے اہداف و مقاصد اور اس کی موجودہ ہیئت تنظیمی کا جامع و مانع تعارف مندرجہ ذیل دو جملوں کے ذریعے ہوسکتا ہے جو تنظیم کے ''نظام العمل'' کی پہلی دفعہ (شق الف اور د) سے ماخوذ ہیں:

''۱) یہ ایک اصولی' اسلامی' انقلابی جماعت ہے جو پہلے پاکستان اور بالآخر کل روئے زمین پر اللہ کے دین کے غلبے' یعنی اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام' یا بالفاظ دیگر اسلامی انقلاب' کے لیے کوشاں ہے۔

۲) اس کی تنظیمی اساس ''سمع وطاعت فی المعروف'' کی شخصی بیعت پر قائم ہے۔''

تاہم اس کا ایک طویل پس منظر ہے' جسے ع ''دیکھئے کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک!'' کے مصداق پیش نظر رکھنا مفید ہی نہیں' ضروری بھی ہے!

☆☆☆☆

''تنظیم اسلامی'' کا نام پہلی بار اب سے تیئیس سال قبل اُس ہیئت تنظیمی کے ضمن میں سامنے آیا تھا جس کے قیام کا فیصلہ اُس اجتماع میں کیا گیا تھا جو ۹'۸ ستمبر ۱۹۶۷ء کو رحیم یار خان

میں منعقد ہوا تھا اور جس میں لگ بھگ چالیس کی تعداد میں ایسے حضرات نے شرکت کی تھی جو اکثر و بیشتر ۵۸۔۱۹۵۷ء میں' اور بعض بعد میں مختلف مراحل پر جماعت اسلامی پاکستان سے علیحدہ ہوئے تھے۔ اس اجتماع میں ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم بھی شریک تھا جو علم و فضل اور تقویٰ و تدین کے اعتبار سے تو کم ترین تھا ہی' جہاں تک یاد پڑتا ہے عمر میں بھی سب سے کم تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس اجتماع کا انعقاد اصلاً اُسی کی تحریک و تحریض اور ڈیڑھ دو سال کی انتھک مساعی کا نتیجہ تھا۔

☆☆☆

۵۸۔۱۹۵۷ء کے دوران میں مولانا مودودی مرحوم کے جن قریب ترین رفقاء نے جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تھی' اُن میں اُن چاروں حضرات کے علاوہ جنہیں مولانا مرحوم کی نظر بندی کے دوران مختلف مواقع پر امارت جماعت کی ذمہ داری تفویض کی جاتی رہی تھی[1] جماعت کی قیادت کی صف دوم کا بہت بڑا حصہ شامل تھا۔ اُن میں سے بعض حضرات تو اس درجہ مایوس اور دل شکستہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے نئی تشکیل و تعمیر کی کسی کوشش میں قطعاً کوئی حصہ نہ لیا (جیسے مولانا عبدالجبار غازی مرحوم اور جناب سعید احمد ملک صاحب) لیکن بقیہ اکابرین میں سے مولانا امین احسن اصلاحی' مولانا عبدالغفار حسن اور حکیم عبدالرحیم اشرف نے بھرپور کوشش کی کہ کوئی نئی ہیئت تنظیمی فوری طور پر وجود میں آ جائے۔ ان کی اس کوشش میں جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والے اُن عام ارکان کی اکثریت بھی شریک تھی جو معتدبہ تعداد میں لاہور' لائل پور (حال فیصل آباد) اور منٹگمری (حال ساہیوال) سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن افسوس کہ مختلف اسباب کی بنا پر یہ مساعی ناکام رہیں' اور جماعت کے سابق ارکان پر مشتمل کوئی نئی اجتماعیت وجود میں نہ آ سکی' جس کے نتیجے میں ایک عمومی مایوسی اور بددلی اس پورے حلقے میں پھیل گئی۔

واضح رہے کہ اگرچہ ان جملہ مساعی میں راقم الحروف بھی ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے شامل رہا تھا' تاہم ایک طویل عرصے تک ان کا اصل اعصابی مرکز بھی لائل پور رہا تھا' اور اُن کی روح رواں کی حیثیت بھی حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب ہی کو حاصل رہی تھی۔ البتہ کچھ عرصہ بعد جب محسوس ہوا کہ حکیم صاحب موصوف کچھ زیادہ ہی مایوس اور بددل ہو گئے ہیں' تو

(۱) یعنی مولانا عبدالجبار غازی مرحوم' مولانا امین احسن اصلاحی' مولانا عبدالغفار حسن اور شیخ سلطان احمد۔

راقم نے ذاتی تحریک اور منٹگمری کے احباب کے تعاون سے ایک بھرپور مشاورتی اجتماع کا اہتمام کیا جو عزیز ٹینریز' ہڑپہ میں منعقد ہوا اور کئی روز تک جاری رہا۔ لیکن افسوس کہ یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ نتیجتاً مایوسی کے سائے مزید گہرے ہو گئے —— اور ۶۱۔۱۹۶۰ء کے لگ بھگ جماعت سے علیحدہ ہونے والے اکابر اور عام ارکان کے حلقے میں کسی نئی تعمیر و تشکیل کے ضمن میں کسی عملی سعی و جہد تو کجا' مستقبل قریب میں اس کی کسی اُمید کے آثار بھی باقی نہ رہے' اور بالعموم وہ فضا طاری ہو گئی جس کا نقشہ ان الفاظ میں سامنے آتا ہے کہ ع ''اب یہاں کوئی نہیں' کوئی نہیں آئے گا!'' —— اگرچہ بحمداللہ اس وقت بھی ذاتی طور پر راقم کے قلبی احساسات کی کیفیت یہ تھی کہ ع ''آگ بجھی ہوئی نہ جان' آگ دبی ہوئی سمجھ!''

☆☆☆

راقم الحروف اوائل ۱۹۶۲ء سے اواخر ۱۹۶۵ء تک بعض خاندانی مسائل کی بنا پر کراچی میں مقیم رہا۔ اس اثناء میں مولانا عبدالغفار حسن بھی مدینہ منورہ منتقل ہو گئے' جہاں اُن کا تقرر جامعہ اسلامیہ میں بحیثیت استاذِ حدیث ہو گیا تھا۔

اواخر ۱۹۶۵ء میں راقم تعمیر جدید اور تشکیل نو کے عزم تازہ کے ساتھ لاہور منتقل ہوا تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنا وہ اختلافی بیان جو اُس نے ۱۹۵۶ء میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کی مقرر کردہ جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا تھا اسے ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے شائع کر دیا' جو دینی حلقوں اور مذہبی جماعتوں کے علاوہ اخبارات و جرائد میں بھی شدّ ومدّ کے ساتھ زیر بحث آیا' جس کے نتیجے میں ''سابقین جماعت'' کے حلقے میں بھی کسی نئی تعمیر و تشکیل کی خواہش از سرِ نو انگڑائی لینے لگی۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء میں جب مولانا عبدالغفار حسن اپنی سالانہ تعطیلات پر پاکستان آئے تو انہوں نے راقم کے ساتھ کامل اتفاق کرتے ہوئے نہ صرف کراچی اور لاہور بلکہ بعض دوسرے مقامات پر بھی سابق ارکان جماعت کو ایک نئی تنظیم کے قیام پر آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کی' اور اُن کی ان مساعی کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے دلوں میں قیام اجتماعیت کی وہ چنگاری جو خاکستر کی موٹی تہہ میں دب چکی تھی دوبارہ پورے آب و تاب کے ساتھ بھڑک اُٹھی۔

مولانا موصوف تو اپنی تعطیلات کے اختتام پر واپس مدینہ منورہ چلے گئے' لیکن اُن کی غیر حاضری میں شیخ سلطان احمد صاحب نے اُن کی نیابت کا حق بخوبی ادا کیا۔ اور نہ صرف مفصل

خط وکتابت کے ذریعے بلکہ اپنی شدید خانگی اور کاروباری مصروفیات کے علی الرغم ایک رفیق کی معیت میں پاکستان کے متعدد اہم مقامات کے سفر کی صعوبت جھیل کر اس تحریک کے پودے کو پروان چڑھایا۔ نتیجتاً جون ۱۹۶۷ء میں آں محترم اور یہ خاکسار رحیم آباد ضلع رحیم یار خاں میں سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم کے دولت کدے پر جمع ہوئے' جہاں طویل گفت وشنید اور بحث وتمحیص کے بعد ہم تینوں نے ایک قرارداد پر دستخط ثبت کر دیئے جو جولائی ۱۹۶۷ء کے ''میثاق'' میں ''قراردادِ رحیم آباد'' کے نام سے شائع ہوگئی۔

اس قرارداد کا اکثر وبیشتر حصہ تو وہی ہے جو تنظیم اسلامی کی ''قراردادِ تاسیس'' کے عنوان سے اس کتاب کے صفحات ۲۶'۲۷ پر درج ہے' البتہ اُس کے پہلے پیراگراف کی بجائے ''قراردادِ رحیم آباد'' میں حسب ذیل عبارت درج تھی:

> ''ہم اس امر پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہماری راہ کے موانع کو دور فرمایا اور حالات کو اس طرح ساز گار فرمایا کہ ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لیے ایک مقام پر جمع ہو سکے۔
>
> ہمارے نزدیک یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل وکرم اور انعام واحسان ہے کہ گفت و شنید کے نتیجہ میں ہم نے محسوس کیا کہ بحمد اللہ ہمارے نقطہ نظر اور طرزِ فکر میں بہت حد تک یکسانی ویک رنگی موجود ہے اور ہم دین کی کسی چھوٹی یا بڑی خدمت کے لیے جمع ہو کر سعی وجہد کر سکتے ہیں۔
>
> بنابریں ہم یہ طے کرتے ہیں کہ ایک ایسی اجتماعیت کا قیام عمل میں لایا جائے جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری ممد ومعاون ہو' جس میں وہ لوگ بھی شریک ہو سکیں جو اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے لیکن پھر مختلف مراحل پر اس سے مایوس ہو کر علیحدہ ہوتے چلے گئے اور اب کسی ہیئت اجتماعی میں منسلک نہ ہونے کی بنا پر تشنگی محسوس کر رہے ہیں' اور وہ لوگ بھی شریک ہو سکیں جنہیں اپنے دینی فرائض کا احساس ہو جائے اور وہ اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے کسی اجتماعی نظم میں منسلک ہونا چاہیں۔''

اور اختتام پر ان الفاظ کا اضافہ تھا:

> ''مندرجہ بالا رہنما اصولوں کی روشنی میں تفصیلی نقشہ کار کی تعیین اور ایک ہیئت اجتماعی کی تشکیل کے لیے طے کیا جاتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو' ہم خیال لوگوں سے رابطہ قائم کیا

جائے اور پھر کوئی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ ایسے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر کسی اجتماعیت کے قیام کی عملی صورت اختیار کر لیں۔ اس کام کی انجام دہی کے لیے فی الحال شیخ سلطان احمد (صاحب) کو مامور کیا جاتا ہے۔''

واضح رہے کہ اس قرار داد کو بھی الفاظ کا جامہ راقم الحروف ہی نے پہنایا تھا اور پھر جب راقم نے لاہور واپس آ کر اسے مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمت میں پیش کیا اور اُن کی جانب سے اس کی بحیثیت مجموعی تائید و تحسین کے بعد طے کیا گیا کہ اس کی ایک مختصر وضاحت بھی ضبط تحریر میں لے آئی جائے تو یہ خدمت بھی راقم ہی نے سر انجام دی۔ دریں اثنا لاہور میں منعقدہ ایک اجتماع میں مجوزہ اجتماعیت کے ضمن میں ایک مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آ چکا تھا ، جس کے ایک اجلاس میں نہ صرف ''قرار دادِ رحیم آباد'' بلکہ متذکرہ بالا توضیحات کو بھی معمولی حکّ و اضافے کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔ چنانچہ ''میثاق'' بابت اگست ۱۹۶۷ء میں یہ تمام چیزیں ''مجلس مشاورت'' کی جانب سے شائع ہو گئیں اور اُن کی اساس پر ایک اجتماع ۹،۸ ستمبر کو بمقام رحیم یار خان طلب کر لیا گیا۔

☆☆☆

رحیم یار خان میں ۶، ۷ ستمبر کو مجلس مشاورت کا اجتماع ہوا......اور بعد ازاں ۹،۸ ستمبر کو کھلے اجلاس ہوئے، جن میں اولاً راقم ہی نے مجوزہ قرار داد اور اس کی توضیحات پڑھ کر سنائیں۔ پھر مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن نے مزید تائیدی اور توضیحی تقریریں کیں۔ شرکاء اجتماع کی جانب سے بعض لفظی ترامیم بھی پیش ہوئیں ...... اور بالآخر قرار داد کو مع توضیحات منظور کر لیا گیا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ قرار دادِ رحیم آباد کے ان ابتدائی تین پیروں کی بجائے جو اوپر نقل ہو چکے ہیں، یہ پیرا شامل کیا گیا:

''آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری ممد و معاون ہو۔''

اور اسی طرح قرار دادِ رحیم آباد کے محولہ بالا آخری الفاظ کی جگہ یہ الفاظ درج کیے گئے کہ:

''مندرجہ بالا رہنما اصولوں کی روشنی میں عملی جدوجہد کے آغاز اور ایک ہیئت اجتماعی کی باقاعدہ تشکیل کے لیے مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل ایک مجلس مشاورت کے تقرر کی توثیق کی جاتی ہے:

۱۔مولانا امین احسن اصلاحی ۲۔ مولانا عبدالغفار حسن
۳۔مولانا عبدالحق جامعی ۴۔شیخ سلطان احمد (معتمد)
۵۔سردار محمد اجمل خان لغاری ۶۔ڈاکٹر محمد نذیر مسلم
۷۔ڈاکٹر اسرار احمد''

''میثاق'' کی ستمبر' اکتوبر ۱۹۶۷ء کی مشترکہ اشاعت میں ترمیم شدہ قرارداد اور توضیحات بھی شائع کر دی گئیں اور مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن کی تقاریر بھی۔ مزید برآں صرف قرارداد اور اس کی توضیحات کو ''ایک نئی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ'' کے عنوان سے ایک کتابچے کی صورت میں بھی شائع کر دیا گیا تا کہ اسے زیادہ وسیع حلقے تک پہنچایا جا سکے۔

☆☆☆

یہ عرض کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے کہ اگرچہ اس نئی تنظیم کی سربراہی یا امارت کے لیے تاحال رسمی طور پر کسی کا نام نہ تجویز ہوا تھا نہ منظور' لیکن اس ''بارات کے دولہا'' بہرحال مولانا امین احسن اصلاحی ہی تھے...... اور اگرچہ اس نئی ہیئت اجتماعی کے نام کے بارے میں بھی متعدد تجاویز کے پیش ہونے کے باوجود کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا' تاہم چونکہ مولانا امین احسن اصلاحی ''تنظیم اسلامی'' کے نام پر مُصر تھے' لہٰذا غیر رسمی طور پر یہ نام بھی تقریباً طے شدہ ہی تھا (اگرچہ راقم الحروف نے یہ احتیاط ملحوظ رکھی تھی کہ یہ اسم علم نہ ''میثاق'' میں استعمال ہوا نہ متذکرہ بالا کتابچے میں)۔

اجتماع رحیم یار خان میں اپنے الوداعی خطاب میں بھی مولانا اصلاحی نے اپنی سابقہ تقصیر کے اعتراف کے ساتھ آئندہ کے لیے عزمِ مصمّم کا اظہار کیا تھا اور اس کے بعد بھی چند ماہ تک ان کی طبیعت میں نشاط کی کیفیت برقرار رہی اور ع ''ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا'' کے سے انبساط و انشراح کا اظہار ہوتا رہا۔ چنانچہ بعض چھوٹے اسفار کے علاوہ ایک طویل سفر بھی انہوں نے از لاہور تا سکھر بذریعہ کار اور وہاں سے کراچی بذریعہ ریل کیا جس میں راقم بھی حضرت موسیٰؑ کے فتیٰ کے مانند اُن کے ساتھ رہا۔

لیکن افسوس کہ ایک حادثہ تو اس سفر کے دوران سکھر میں ایک اجتماع عام کے موقع پر پیش آ گیا...... اور بعض دوسرے حوادث اس کے کچھ عرصہ بعد رونما ہو گئے جن کے نتیجے میں ایک جانب تو مولانا اصلاحی کی طبیعت بجھ کر رہ گئی...... اور دوسری جانب بعض اہم رفقاء کے مزاج

میں بھی تکدر پیدا ہوگیا۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے ساتھ سابق تعلق کی قدرِ مشترک کی اساس پر نئی تنظیم کے قیام کی یہ آخری کوشش بھی ع ''خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود'' کا مصداقِ کامل بن گئی!

☆☆☆

تاہم راقم الحروف نے اُسی وقت طے کرلیا تھا کہ اقامت دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے بلند و بالا مقاصد کے لیے خالص اصولی اور انقلابی طریق پر جدوجہد' یا بالفاظ دیگر اسلامی انقلاب کی سعی کے لیے ٹھیٹھ اسلامی اصولوں پر کسی نئی تحریک کے اجراء اور تنظیم کے قیام کے لیے خود اپنی بساط کے مطابق کوشش جاری رکھے گا' خواہ اُسے ''نئے سفر'' اور نئی تعمیر و تشکیل کے لیے تنہا ہی آغاز کرنا پڑے۔

لاہور میں حلقہ ہائے مطالعہ قرآن اور ''دارالاشاعت الاسلامیہ'' کا قیام اور ماہنامہ ''میثاق'' کا دوبارہ اجراء پہلے ہی عمل میں آ چکا تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم کے انقلابی فکر اور ولولہ انگیز دعوت کی اساس پر ہم خیال لوگوں کا ایک بالکل نیا حلقہ وجود میں آ چکا تھا جو فطری تدریج کے ساتھ مسلسل ترقی کر رہا تھا۔ چنانچہ اب راقم نے اپنے جسم و جان کی تمام توانائیوں کو بالکل یکسو ہوکر اور ع ''شرطِ اوّل قدم این است کہ مجنوں باشی'' کے سے انداز میں قرآن کی انقلابی دعوت کے نشر و اشاعت پر مرکوز کردیا۔(۱) اس کے نتیجے میں اولاً ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام عمل میں آیا اور ۲۱/ جولائی ۱۹۷۴ء کی شام کو اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر راقم نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کردیا کہ آئندہ معاملہ صرف قرآن کے درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم تک محدود نہیں رہے گا اور صرف ''انجمن'' پر اکتفا نہیں ہوگی بلکہ اقامت دین کی اجتماعی جدوجہد کے لیے ایک باضابطہ ''جماعت'' کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

☆☆☆

راقم الحروف کی متذکرہ بالا تقریر' تسوید و تبییض کے جملہ مراحل طے کر کے بعض اضافوں کے ساتھ کچھ ''میثاق'' بابت ستمبر ۱۹۷۴ء میں اور بقیہ اکتوبر اور نومبر کی مشترک اشاعت میں شائع ہوگئی جس کے ذریعے راقم نے اپنا ذہنی و فکری پس منظر' سابقہ تحریکی و جماعتی تعلق اور فرائض دینی کے بارے میں اپنا تصور پوری طرح واضح کردیا (یہ تقریر جو پہلے ''سرافگندیم'' کے

---

(۱) اس کی تفصیلی روداد کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی تالیف: ''دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر!''

نام سے طبع ہوتی رہی تھی، اب ''عزمِ تنظیم'' کے عنوان سے شائع ہو رہی ہے)۔

پھر ''میثاق'' بابت اکتوبر، نومبر میں راقم نے ایک جانب ایک طویل مقالے کے ذریعے امّتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے دوران عروج اور زوال کے دو دو ادوار کی وضاحت اور تیسرے عروج کی جانب پیش قدمی کے ضمن میں ''ہمہ جہتی احیائی عمل'' کے مختلف گوشوں کی تعیین کے ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی کہ راقم اور اُس کی تجویز کردہ تنظیم اُن میں سے کون سے گوشے سے تعلق رکھتی ہے ـــــ اور دوسری جانب ۱۹۶۷ء کے اجتماع رحیم آباد کی منظور کردہ قرارداد مع توضیحات بھی شائع کر دی اور مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن کی تقاریر کے علاوہ وہ تائیدی تبصرے بھی شائع کر دیئے جو ۶۸۔۶۷ء میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی رحمہما اللہ نے کیے تھے...... اور اعلان کر دیا کہ ان ہی فکری ونظری اساسات پر ایک نئی تنظیم کی تشکیل اگلے سال (۱۹۷۵ء) کے اوائل میں ہو جائے گی!

☆☆☆

۱۹۶۷ء کی قرارداد کے بارے میں راقم الحروف کو اُس وقت بھی یہ احساس تھا کہ اس میں اقامت دین کی فرضیت کا تصور کچھ دب گیا ہے اور اس کی اہمیت کما حقہٗ واضح نہیں ہو رہی...... اور اگرچہ دین کی اقامت کی اصطلاح اس میں موجود ہے تاہم بحیثیت مجموعی اُس سے اصلاً ایک تبلیغی اور اصلاحی تحریک کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ اس کا اصل سبب بھی راقم کے سامنے واضح تھا، یعنی یہ کہ جماعت اسلامی کی تحریک کی قلب ماہیت اور ایک اسلامی انقلابی جماعت کے بجائے اسلام پسند قومی سیاسی جماعت کا انداز اختیار کر لینے اور اس کے نتیجے میں اُس کے کارکنوں کے مزاج میں سیاسی رنگ کے غلبے نے سابقین جماعت کے حلقے میں ردِّعمل کے طور پر ''دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے!'' اور ''سانپ کا ڈسا رسّی سے بھی ڈرتا ہے!'' کے مطابق ''انقلاب'' کے لفظ سے وحشت (allergy) پیدا کر دی تھی...... اس کے باوجود راقم نے نئی تشکیل کے لیے قراردادِ تاسیس کے طور پر اُسی کو اختیار کیا۔ اس لیے کہ ایک تو اس کی شدید خواہش تھی کہ ۱۹۶۷ء میں جمع ہونے والے تمام بزرگ اور احباب اس میں شمولیت اختیار کر لیں اور اس ضمن میں اُن پر یہ حجت قائم ہو جائے کہ نئے سفر کا آغاز ٹھیک اسی مقام سے کیا جا رہا ہے جہاں سے سات سال قبل قافلہ منتشر ہوا تھا...... اور دوسرے اسے یقین تھا کہ جیسے ہی قافلہ مصروف سفر ہو گا سابقہ تجربات اور ایک طویل عرصے کے جمود کے

باعث جو وحشت پیدا ہوگئی ہے خود بخود رفع ہو جائے گی اور......ع ''پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود!'' کے مصداق سب بھولے ہوئے سبق دوبارہ یاد آ جائیں گے۔ (اس کا ایک ثبوت بھی راقم کو بالکل ابتدائی مرحلے ہی پر مل گیا تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم کے مزاج میں متذکرہ بالا وحشت کی شدت کے باعث قرارداد رحیم آباد میں ان الفاظ کے بعد کہ: ''لٰہذا پیش نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں فرد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا کما حقہٗ لحاظ رکھا جائے!'' مزید تاکید اور حزم و احتیاط کے لیے یہ الفاظ بھی شامل تھے کہ ''اور اُسے محض کسی اجتماعی انقلاب کے لیے آلہ کار کی حیثیت نہ دے دی جائے!'' ......لیکن جیسے ہی جمود ٹوٹا اور حرکت کا آغاز ہوا تو اس وحشت کی شدت میں فوراً کمی آ گئی۔ چنانچہ رحیم یار خان میں منظور ہونے والی قرارداد سے یہ الفاظ حذف کر دیئے گئے۔

☆☆☆

تنظیم اسلامی کا تاسیسی اجلاس ۲۷ اور ۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے دفتر واقع ۱۲-اے، افغانی روڈ، سمن آباد لاہور میں منعقد ہوا جس میں لاہور کے علاوہ کراچی، سکھر، بہاول پور، ساہیوال، فیصل آباد، شیخوپورہ، گوجرانوالہ اور بعض دوسرے مقامات سے کُل ایک سو تین (۱۰۳) افراد شریک ہوئے۔

ان میں اوّل تو جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے حضرات کی کل تعداد بھی پانچ چھ سے زیادہ نہ تھی، مزید برآں وہ سب بھی جماعت کے عام ارکان میں سے تھے، اور اُن میں سے کوئی بھی جماعت اسلامی میں کبھی کسی منصب پر فائز نہیں رہا تھا (سوائے شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے کہ وہ کراچی کی جماعت کے معروف اور نمایاں لوگوں میں شامل رہے تھے)۔ گویا یہ پورا قافلہ راقم کی دعوتِ قرآنی کے نتیجے میں عالمِ وجود میں آیا تھا اور اس کے جملہ اساسی تصورات مطالعہ قرآن حکیم کے اُس منتخب نصاب پر مبنی تھے جسے راقم نے اپنی دعوتِ قرآنی کا مرکز و محور بنایا تھا۔

چنانچہ راقم نے اس اجلاس کی افتتاحی نشست میں بھی ایک بار پھر اپنے مطالعۂ قرآن کا نچوڑ پیش کیا اور سورۃ الصّف کے دوسرے رکوع اور سورۃ الحجرات کی آیات ۱۴، ۱۵ کے حوالے سے فرائض دینی کا جامع تصور اور اس کے ضمن میں شہادت علی الناس اور غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد کی فرضیت اور اس کے لیے التزام جماعت کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے ساتھ ہی راقم

نے ۱۹۶۷ء والی قراردادِ تاسیس مع توضیحات پڑھ کر سنائی اور اس کی پُرزور وکالت کی' صرف اس لیے نہیں کہ یہ اس کے اپنے رشحاتِ قلم تھے' بلکہ اس لیے کہ اقامتِ دین کے بلند و بالا مقصد کے لیے جو مردانِ کار درکار ہیں اُن کی فراہمی اور سیرت سازی کے لیے جو پروگرام اُس قرارداد اور اُس کی توضیحات کے ذریعے سامنے آتا ہے اُس کی صحت و حقانیت پر میرا دل ۷۵۔۱۹۷۴ء میں بھی اتنا ہی مطمئن تھا' جتنا ۶۷۔۱۹۶۶ء میں۔ اور الحمد للہ کہ ان سطور کی تحریر کے وقت بھی (جنوری ۱۹۹۱ء) راقم کو یقین کامل حاصل ہے کہ فرائضِ دینی کی پہلی دو منزلوں یعنی بندگی رب اور شہادت علی الناس کے اُصول و مبادی کے ضمن میں اس قرارداد اور اس کی توضیحات کو ایک اہم اور جامع دستاویز کی حیثیت حاصل ہے (چنانچہ اس کتاب کا حصہ اول اسی قرارداد اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے)۔ بہر حال چونکہ یہ اجتماع اِن ہی کی اساس پر طلب کیا گیا تھا لہٰذا اس کا کوئی امکان ہی موجود نہ تھا کہ ان کے کسی نکتے سے شرکاء اجلاس میں سے کسی کو کوئی اختلاف ہو۔ لہٰذا اِن کی منظوری کا مرحلہ بآسانی طے ہو گیا۔

☆☆☆

اگلا مرحلہ ''نام' شرائط شمولیت' ہیئت تنظیمی' اور قواعد و ضوابط'' کی منظوری کا تھا جن میں سے نہ نام کے سلسلے میں کوئی ردّ و قدح ہوئی' نہ ہیئتِ تنظیمی' اور قواعد و ضوابط کے ضمن میں کوئی مشکل پیش آئی۔ البتہ شرائطِ شمولیت میں شامل بعض کڑوی گولیوں کا نگلنا موجود الوقت حالات میں بہت سے احباب کو دشوار ہی نہیں محال نظر آیا۔

چنانچہ نام کے ضمن میں اتفاق رائے کے ساتھ ''تنظیم اسلامی'' ہی کے حق میں فیصلہ ہو گیا' اور اُس وقت کے دستورِ تنظیمِ اسلامی کی دفعہ ''ا'' یہ قرار پائی:

''اس تنظیم کا نام تنظیم اسلامی ہوگا۔''

اسی طرح ہیئت تنظیمی کے ضمن میں حسبِ ذیل اُمور بھی بالاتفاق طے پا گئے:

دفعہ ۳: ہیئتِ تنظیمی

''تنظیمی اعتبار سے پہلے تین سال ایک عبوری دور شمار ہوں گے جن کے دوران میں مقدور بھر سعی کی جائے گی کہ تجدید ایمان' توبہ اور تجدید عہد کی وہ دعوت زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا دی جائے جس کی تفصیل دفعہ ۲ میں دی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شامل ہو سکیں۔ اس عرصے کی تکمیل پر ایسے تمام لوگوں کا ایک عام اجتماع طلب

کیا جائے گا جو ''تنظیم اسلامی'' کے لیے مستقل دستور طے کرے گا۔ گویا دفعاتِ آئندہ میں جو تنظیمی ڈھانچہ دیا جا رہا ہے وہ صرف اس عبوری دور کے لیے شمار ہو گا۔

دفعہ ۴: مرکزی نظام

(الف) ڈاکٹر اسرار احمد کو تنظیمِ اسلامی کے ''داعی عمومی'' کی حیثیت حاصل ہو گی اور وہ اس عبوری دور میں ''اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'' کے وسیع تر اصول کے تحت تنظیم کے معاملات کو بھی چلائیں گے اور اس کی دعوت کو بھی زیادہ سے زیادہ وسیع تر حلقے تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ وہ ایک معین مجلس شوریٰ کو بھی نامزد کرنے کے مجاز ہوں گے لیکن ان کو حق استقرار حاصل ہو گا۔

(ب) تمام رفقائے تنظیم داعیٔ عمومی کی ''اطاعت فی المعروف'' کے پابند ہوں گے!''

رہے ''قواعد وضوابط'' تو چونکہ اِن اصولی باتوں کے طے ہو جانے کے بعد زیادہ تفصیلی قواعد و قوانین کی چنداں ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی' لہٰذا وہ سب کے سب پانچ دفعات کی صورت میں کل تین صفحات میں سما گئے اور وہ بھی بالاتفاق طے ہو گئے۔

جہاں تک متذکرہ بالا دستور کی دفعہ ۲ میں شامل ''شرائطِ شمولیت'' کا تعلق تھا اس کی بھی کل چھ میں سے صرف ایک یعنی چوتھی شق ایسی تھی جو بہت سے احباب کے تنظیم میں شامل ہونے کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔ اس لیے کہ اُس کی رُو سے یہ لازم آتا تھا کہ صرف وہی لوگ تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کر سکیں گے جو تجارتی اور نجی ہر نوع کے سُودی لین دین سے عملاً تائب ہو جائیں' اور ایسے اداروں کی ملازمت بھی ترک کر دیں جن میں سودی لین دین کا غلبہ ہو جیسے بنک اور انشورنس کمپنیاں وغیرہ۔ مزید برآں سرکاری محاصل یعنی انکم ٹیکس' سیلز ٹیکس وغیرہ کے ضمن میں بھی کسی غلط بیانی سے ہرگز کام نہ لیں۔ ان شدید وثقیل اور موجود الوقت احوال وظروف کے اعتبار سے تقریباً ناممکن العمل پابندیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان ۱۰۳ حضرات میں سے جو اس اجتماع میں ابتداءً شریک ہوئے تھے صرف ۶۲ حضرات نے تنظیم میں بالفعل شرکت اختیار کی۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ تنظیم کی ''شرائطِ شمولیت'' کی متذکرہ بالا شق بھی اصلاً جماعت اسلامی ہی کے فلسفہ واصولِ تنظیم کے تسلسل کی مظہر تھی۔ اس معاملے میں اگرچہ ذاتی طور پر راقم الحروف کے نظریات تبدیل ہو چکے تھے' تاہم چونکہ شدید

دلی خواہش تھی کہ جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والے احباب واکابر کی زیادہ سے زیادہ تعداد اس نئے قافلے میں شامل ہو اور اُن کی اکثریت بالخصوص اہم شخصیات کے تصورات میں ابھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی' لہٰذا جہاں یہ مناسب سمجھا گیا کہ تنظیم کے ''مستقل دستور'' کے معاملے کو ابھی ''کھلا'' (open) رکھا جائے وہاں ''شرائطِ شمولیت'' کے ضمن میں بھی سابقہ طرزِ فکر ہی کو برقرار رکھا گیا۔

☆☆☆

تنظیم اسلامی کے ابتدائی عارضی دستور کی دفعہ نمبر۲' صرف مذکورہ شق نمبر۴ میں معمولی لفظی تبدیلی کے ساتھ' پیش نظر کتابچے کے حصہ دوم میں ''عقائد اور بنیادی دینی تصورات'' کے عنوان سے شامل ہے۔ یہ بھی اصلاً راقم ہی کی تحریر پر مشتمل ہے جو جولائی ۱۹۷۴ء اور مارچ ۱۹۷۵ء کے درمیانی عرصے میں سپردِ قلم ہوئی۔ اس کی ترتیب وتسوید میں راقم نے جماعت اسلامی کے دستور سے بھی استفادہ کیا اور بعض علماء سے بھی مشورہ کیا جن میں مولانا سید وصی مظہر ندوی قابل ذکر ہیں' جو اگرچہ اُس وقت تک جماعتِ اسلامی میں شامل تھے تاہم اُن کی جماعت کی مقامی' صوبائی اور مرکزی قیادت کے ساتھ کشاکش شدت کے ساتھ جاری تھی جس کے نتیجے میں وہ ۱۹۷۶ء میں جماعت سے خارج کر دیئے گئے۔

اس کی پہلی شق ایمانِ مجمل اور ایمان مفصل پر مشتمل ہے' جن کی تشریح میں اہلِ سنت کے عقائد اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ آ گئے ہیں۔ واضح رہے کہ جماعت اسلامی کے دستور میں اِن کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

دوسری شق کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت پر مشتمل ہے۔ اس کی تشریح کے سلسلے میں جماعت اسلامی کے دستور سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے' اس لیے کہ توحید الٰہی اور رسالتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اقرار کے مضمرات ومقدرات کو دستورِ جماعت میں بلاشبہ نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے (اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ تحریر اصلاً مولانا محمد منظور نعمانی کی ہے۔ واللہ اعلم)۔ البتہ ایک جانب اس میں سے وہ الفاظ حذف کر دیئے گئے جن پر علماء کرام کی جانب سے شدید اعتراضات کیے گئے تھے' اور دوسری جانب عظمت صحابہؓ اور حجیت خلافت راشدہ سے متعلق شقوں کا اضافہ کیا گیا' اس لیے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نبی اکرم ﷺ کی تعلیم' تربیت اور تزکیے کا شاہکار ہونے کے اعتبار سے تعظیم وتوقیر کے مستحق بھی ہیں ——— اور

بجوائے الفاظِ قرآنی ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ'' اور ''فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ'' آنحضورﷺ کے رفقاء واحباب اوراعوان وانصار ہونے کی بنا پراس کا استحقاقِ کامل بھی رکھتے ہیں کہ آنحضورﷺ کے ہر اُمتی کے دل میں ان کے لیے شدید محبت اوراحسان مندی کے جذبات موجود ہوں —— اور خلافتِ راشدہ چونکہ اصلاً خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی حیثیت رکھتی ہے' لہٰذا اُس کے دوران میں جن امور پر اُمت کا اجماع ہوگیا انہیں دین کے دستوری اور قانونی نظام میں حجت کی حیثیت حاصل ہے۔ اس طرح عظمت صحابہؓ اور حجیتِ خلافت ِراشدہ کو گویا نبی اکرمﷺ کی رسالتِ مبارکہ کے ساتھ تتمے اور ضمیمے کی حیثیت حاصل ہے!

تیسری اور چوتھی شقیں شرک' کفر اور ذمائم اخلاق سے براءت اور جملہ ذنوب ومعاصی سے توبہ واستغفار پر مشتمل ہیں۔ان کے ضمن میں جہاں کفر اور شرک کی حقیقت اور اُن کی اقسام کی مختصر مگر جامع وضاحت آ گئی ہے' وہاں فرائض و واجباتِ دینی اور محرمات ومنہیاتِ شرعی کا اجمالی تذکرہ بھی ہوگیا ہے۔ان ہی میں وہ ''کڑوی گولیاں'' بھی شامل ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے' یعنی کسبِ معاش کے سلسلے میں محرمات ومنکرات سے اجتناب!

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' ابتداء میں جوصورت اختیار کی گئی وہ یہ تھی کہ صرف وہی لوگ تنظیم اسلامی میں شامل ہوسکیں گے جوان منکرات کو بالفعل ترک کر چکے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تاسیسی اجلاس کے ابتدائی ۱۰۳ شرکاء میں سے صرف ۶۲ حضرات تنظیم میں شمولیت اختیار کر سکے! لیکن تقریباً ڈھائی سال بعد جب تنظیم کے لیے بیعت کے نظام کو اختیار کیا گیا تو متعلقہ عبارت میں بھی مناسب لفظی ترمیم کر دی گئی اس لیے کہ نظامِ بیعت کا تو اصل الاصول ہی یہ ہے کہ کوئی شخص جب' جہاں اور جیسے ہی عزم اور ارادہ کر لے کہ وہ مسلمان جئے اور مسلمان مرے گا اوراپنے جملہ فرائض دینی کوادا کرنے کے لیے امکان بھر کوشاں رہے گا وہ فوراً بیعت کر کے راہِ حق کے قافلے میں شامل ہوسکتا ہے۔ تعلیم' تربیت اور تزکیے کے مراحل بعد میں آتے ہیں۔ گویا اب اِس شق کی حیثیت اِس پیشگی تنبیہہ کی ہے کہ جو شخص بھی تنظیم میں شامل ہو وہ اچھی طرح جان لے کہ اسے اِن منکرات ومحرمات کو جلد از جلد ترک کرنا ہے۔

پانچویں اور چھٹی شقیں دو ''معاہدوں'' پر مشتمل ہیں: پہلا عہد اللہ سے کہ میں نے اپنا رُخ ہر جانب سے یکسو ہو کر صرف تیری جانب کر لیا ہے اور اب میری نماز اور قربانی کی طرح میرا جینا اور مرنا بھی صرف تیرے لیے ہوگا —— اور دوسرا عہد تنظیمِ اسلامی سے کہ میں اس کے نظم کی

پابندی اوراس کے ایسے جملہ احکام کی اِطاعت جو شریعت کی کسی واضح نص کے خلاف نہ ہوں ''سمع وطاعت'' کی ٹھیٹھ اسلامی روح کے مطابق کروں گا!

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ تنظیم کے عقائد اور بنیادی دینی نظریات کی متذکرہ بالا چھ شقوں کا تعلق اُن تین اہم دینی اصطلاحات سے ہے جو ''تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت'' کے عنوان سے چند آیاتِ قرآنیہ کے ساتھ ابتداء ہی سے جلی طور پر شائع ہوتی رہی ہیں' یعنی: تجدید ایمان' توبہ اور تجدیدِ عہد! چنانچہ پہلی دو شقوں کا تعلق تجدید ایمان سے ہے' درمیانی دو کا توبہ سے اور آخری دو کا تجدید عہد سے!!

اللہ تعالیٰ ہم سب کے قلوب واذہان کو ایمانِ حقیقی اور یقین ومعرفت کے نور سے منور فرمائے' ہمیں جملہ فرائض وواجبات کے التزامِ تام اور منکرات ومنہیات سے اجتنابِ کلی کی توفیق عطا فرمائے' اور اپنے جملہ عہُود وعقود کے ایفائے کاملہ کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

☆☆☆

ذاتی طور پر راقم الحروف کی رائے جماعت سے علیحدگی کے دو سال کے اندر اندر یعنی اپریل ۱۹۵۹ء کے لگ بھگ ہی یہ بن چکی تھی کہ اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعت کی تنظیمی اساس بیعت کے مسنون اور ماثور اُصول پر قائم ہونی چاہیے نہ کہ عہدِ حاضر کے مغرب سے درآمد شدہ دستوری اور جمہوری اصولوں پر —— تاہم راقم کے نزدیک نہ مقدم الذکر ہیئت تنظیمی فرض یا واجب کے درجہ میں ہے نہ مؤخر الذکر مباحات کے دائرے سے خارج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آٹھ سال بعد ۱۹۶۷ء میں اولاً رحیم آباد اور پھر رحیم یار خاں میں ایک نئی تنظیم کے قیام کا فیصلہ ہوا تو راقم اُس میں پورے انشراح ہی نہیں' بھرپور جوش وخروش کے ساتھ شریک ہوا' حالانکہ جیسے کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے' یہ بات اظہر من الشّمس تھی کہ اس ''بارات کے دولہا'' کی حیثیت مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو حاصل تھی' اور وہی بلا شائبہ ریب وشک مجوزہ تنظیم کے امیر بنتے اور اُن کے بارے میں یہ بات ظاہر وباہر اور معلوم ومعروف تھی کہ اُن کا شدید رجحان ہی نہیں قطعی وحتمی رائے دستوری اور جمہوری نظام جماعت کے حق میں ہے۔ اسی طرح مزید آٹھ سال بعد یعنی ۱۹۷۵ء میں جب موجودہ تنظیم اسلامی کی تاسیس کا مرحلہ آیا تب بھی راقم نے نظامِ جماعت کے مسئلے کو کھلا رکھا اور پہلے تین سالوں کو عبوری دور قرار دیتے ہوئے اپنی حیثیت صرف کنوینر کی رکھی تاکہ جماعتِ اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے

دوسرے بزرگ حضرات بھی شمولیت پر آمادہ ہو جائیں تو اُن کے مشورے بلکہ صوابدید کے مطابق ہیئتِ تنظیمی تشکیل دے لی جائے! اوراس میں ہرگز کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ اگر وہ حضرات شمولیت اختیار کر لیتے تو لامحالہ ایک دستوری اور جمہوری نظم ہی قائم ہوتا۔

لیکن جب دو ڈھائی سال کے انتظار کے بعد ثابت ہو گیا کہ بزرگ سابقینِ جماعت میں سے کوئی ایک شخص بھی اس نئے قافلے میں شمولیت پر آمادہ نہیں ہے' تو چار و ناچار راقم کو یہ فیصلہ کر لینا پڑا کہ اب اسے اپنی ذاتی صوابدید ہی کو بُروئے کار لانا ہے اور اپنی رائے کو پورے شرح وبسط کے ساتھ رفقاء کے سامنے رکھ دینا ہے تاکہ بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾ (الانفال:٤٢) جسے ساتھ دینا ہے وہ بھی پورے انشراحِ صدر کے ساتھ دے' اور جسے ساتھ چھوڑ دینا ہے وہ بھی خوب سوچ سمجھ کر علیحدہ ہو!

☆☆☆

تنظیم اسلامی کا پہلا سالانہ اجتماع ۲۵ تا ۲۷ مارچ ۱۹۷۶ء اپنے مقامِ تاسیس ہی پر منعقد ہوا تھا اور دوسرے سالانہ اجتماع کے انعقاد کے لیے بھی اواخر مارچ ۱۹۷۷ء کی تاریخوں کا تعین ہو چکا تھا کہ اچانک ملکی انتخابات میں حکومت وقت کی جانب سے کی گئی دھاندلیوں کے خلاف احتجاجی مظاہروں نے ملک گیر تحریک کی صورت اختیار کر لی جو ''تحریک نظامِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم)'' کے نام سے موسوم ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی۔ لہٰذا تنظیم کے اجتماع کو ملتوی کرنا پڑا۔ ۴ اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب کو ملک میں مارشل لاء نافذ ہوا تو امن وامان کی صورت حال بحال ہوئی اور چونکہ کچھ اندازہ نہ تھا کہ تین ماہ بعد مارشل لاء کے اختتام پر ملک میں دوبارہ کیسے حالات پیدا ہو جائیں' لہٰذا بعض اہم رفقاء کے مشورے سے طے کر لیا گیا کہ پہلی فرصت میں تنظیم کا ایک اجتماع منعقد کر لیا جائے جو دوسرے اور تیسرے سالانہ اجتماعات کا قائم مقام ہو اور اس میں تنظیم کے مستقل نظام کے بارے میں حتمی فیصلہ کر لیا جائے۔

یہ اجتماع جو' کچھ دو اجتماعات کے قائم مقام ہونے کے ناتے اور کچھ اہم موضوعات پر تفصیلی گفت وشنید اور بحث وتمحیص کی ضرورت کے پیشِ نظر پورے ایک ہفتے کے لیے طلب کیا گیا تھا' ۵ تا ۱۱ اگست ۱۹۷۷ء قرآن اکیڈمی' ماڈل ٹاؤن' لاہور میں جاری رہا۔ اس میں راقم

نے حسبِ ذیل تین تنقیحات کے ذیل میں نہ صرف یہ کہ اپنے دینی فکر کو پوری وضاحت اور شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا بلکہ جملہ شرکاءِ اجتماع کو بھی اظہارِ خیال اور اختلافِ رائے کا پورا موقع فراہم کیا:

''۱) اقامت دین' شہادت علی الناس اور غلبہ و اظہارِ دین کی **سعی و جہد** نفلی عبادت **یا** اضافی نیکی نہیں بلکہ از روئے قرآن وحدیث **بنیادی دینی فرائض** میں شامل ہے۔

۲) اس دینی فریضہ کی ادائیگی کے لیے **التزامِ جماعت** واجب ہے۔

۳) ایسی دینی جماعت کی ہیئتِ تنظیمی مغرب سے درآمد شدہ دستوری' قانونی اور جمہوری طرز کی نہیں بلکہ قرآن وسنت اور اسلاف کی روایات سے مطابقت رکھنے والے **بیعت** کے اصول پر مبنی ہونی چاہیے۔''

الحمد للہ کہ ان تنقیحاتِ ثلاثہ پر پورے چھ دن سیر حاصل گفتگو ہوئی جس کے نتیجے میں شرکاءِ اجتماع کی غالب اکثریت نے راقم کے خیالات اور نظریات سے کامل اتفاق کیا اور بالآخر ناظم عمومی جناب شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کی تحریک پر حسب ذیل قرارداد منظور ہوگئی:

''تنظیم اسلامی کا یہ اجتماع عام حسبِ دفعہ ۳ دستور تنظیم اسلامی طے کرتا ہے کہ:

۱۔ آئندہ تنظیمِ اسلامی کا نظام مغرب سے درآمد شدہ دستوری' قانونی اور جمہوری اُصولوں کے بجائے قرآن وسنت سے ماخوذ اور اسلاف کی روایات کے مطابق بیعت کے اصول پر مبنی ہوگا۔ چنانچہ تنظیم اسلامی کے داعی عمومی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب آج کے بعد سے ''امیر تنظیم اسلامی'' ہوں گے۔ تنظیم میں داخلہ ان کے ساتھ اطاعت فی المعروف کی بیعت کا شخصی رابطہ استوار کرنے سے ہوگا اور وہ بحیثیت امیر تنظیم اسلامی اپنے فرائض ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ اور ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ کی قرآنی ہدایات کے مطابق ادا کریں گے۔

۲۔ اس فیصلے سے لازم آتا ہے کہ:

(i) تنظیم اسلامی میں جو حضرات اب تک شریک رہے ہیں ان کی رفاقت آج سے ختم شمار ہوگی' تاآنکہ وہ اس قرارداد کے جزو اوّل کے مطابق بیعت کے نظم میں شامل ہو جائیں۔

(ii) تنظیم اسلامی کا موجودہ دستور بھی کالعدم متصور ہوگا اور امیر تنظیم اسلامی جناب

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اختیار ہوگا کہ وہ جن رفقاء سے مناسب سمجھیں مشورہ کر کے آئندہ کا دستور العمل طے کر لیں۔''

۱۰/اگست ۱۹۷۷ء کو اس قرارداد کی منظوری اور اس پر جملہ شرکاء اجتماع کے دستخط ثبت ہونے پر گویا تنظیم اسلامی کا عبوری دور ختم اور نیا اور مستقل دور شروع ہو گیا' جو بحمد اللہ تا حال جاری ہے۔

اس عرصے کے دوران اگر کوئی خیر ذاتی طور پر راقم الحروف اور اجتماعی طور پر تنظیم اسلامی سے بن آیا ہے تو وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور توفیق و تیسیر کا مظہر ہے — اور کوتاہیاں اور لغزشیں سرزد ہوئیں تو ہمارے اپنے نفوس کی شرارتوں کی بنا پر — چنانچہ آئندہ کے لیے اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ وہ اپنے خصوصی فضل و کرم سے نوازتے ہوئے ہدایت و استقامت میں اضافہ فرمائے اور شیطان کے فریب اور نفس کی شرارتوں سے اپنی حفاظت میں رکھے! رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ! آمین!

☆☆☆

تنظیم اسلامی کے لیے اُصولی طور پر ''بیعت سمع وطاعت فی المعروف'' کی تنظیمی اساس کو اختیار کر لینا تو مشکل نہ تھا لیکن موجودہ حالات میں اس بنیاد پر ایک جماعتی نظام کا ڈھانچہ بالفعل کھڑا کرنا ہرگز آسان نہ تھا۔ اس لیے کہ ایک جانب یہ تصور ''آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل'' کے مصداق ذہنوں سے بالکل خارج ہو چکا تھا' اور دوسری جانب ''بیعت'' کے ساتھ ایسے بہت سے عجیب و غریب تصورات لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں جن سے موجودہ ذہن ہی نہیں خود فطرتِ انسانی اِبا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء میں کچھ عرصے تک ہم خود بھی اس کے اظہار و اعلان میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے رہے کہ دنیا کیا کہے گی —ع ''کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!'' بعد میں جب اس کا چرچا عام ہوا تو نہ صرف تمسخر اور استہزاء' بلکہ تردید اور مخالفت کا بازار بھی گرم ہوا — لیکن بحمد اللہ اب جبکہ اس نظام کو بالفعل چلتے ہوئے چودہ برس ہونے کو آئے ہیں' اور نہ صرف اندرون ملک کثیر تعداد میں' بلکہ بیرون ملک حتیٰ کہ انگلستان اور امریکہ میں مقیم حضرات نے بھی معتدبہ تعداد میں اپنے فرائضِ دینی کی ادائیگی کے لیے بیعت کا قلادہ گردن میں ڈالنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی ہے' ہم اپنے دلوں میں گہرے تشکر آمیز اطمینان کا احساس موجزن پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک مردہ

سنت کے احیاء کی توفیق عطا فرمائی۔ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ !!

بیرونی تمسخر اور مخالفت کو برداشت کرنے سے زیادہ کٹھن مرحلہ اُن غلط تصورات کے خاتمے کا تھا جو بیعت کے لفظ کے ساتھ لامحالہ وابستہ ہو گئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور مکروہ تصور یہ ہے کہ بیعت کے نظام میں نہ باہمی مشاورت کی کوئی گنجائش ہے نہ اختلافِ رائے اور اظہارِ خیال کا کوئی موقع! چنانچہ ہمیں اس غلط تصور کی نفی اور اس حقیقت کے اثبات میں بہت محنت بھی کرنی پڑی اور بہت سا وقت بھی صرف کرنا پڑا کہ نظامِ بیعت میں اختلافِ رائے کی گنجائش' اظہارِ خیال کے مواقع' اور باہمی مشاورت کا میدان نام نہاد جمہوری نظام سے بھی وسیع تر موجود ہے ـــــ اور فرق صرف اتنا ہے کہ جمہوری نظام میں آخری فیصلہ ع ''بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!'' کے مصداق آراء کی گنتی کی بنیاد پر ہوتا ہے جبکہ نظامِ بیعت میں اظہارِ رائے اور کھلی بحث وتمحیص کے بعد آخری فیصلہ صاحبِ امر کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے! گویا نظامِ بیعت میں اُصولِ قرآنی: ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ (الشوریٰ : ۳۸) کی بالفعل تعمیل حکم قرآنی: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ (آل عمران: ۱۵۹) کے مطابق ہوتی ہے۔

دوسری جانب اس تصور کا خاتمہ بھی ہرگز آسان نہ تھا کہ مشاورت باہمی کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اکثریت کی رائے کو فیصلہ کن قرار دیا جائے' اس لیے کہ عہد حاضر میں ''سلطانیٔ جمہور'' کا تصور نہ صرف یہ کہ حددرجہ عالمگیر اور ہمہ گیر ہو چکا ہے بلکہ لوگوں کے شعور ہی نہیں تحت الشعور کی گہرائیوں میں اس حد تک سرایت کر چکا ہے کہ بسا اوقات بیعت کے نظام کو اصولاً تسلیم اور اختیار کر لینے کے بعد بھی اس پر اصرار برقرار رہتا ہے کہ امیر کو شوریٰ کی اکثریت کے فیصلے کا ''پابند'' ہونا چاہیے۔

الغرض تنظیم اسلامی کے لیے بیعت کا نظام اُصولی طور پر تو ۱۹۷۷ء میں اختیار کر لیا گیا تھا' اور اس کے بعد سے عملاً تنظیم کی گاڑی اسی پٹڑی پر چل رہی ہے' تاہم اس کے مضمرات اور متضمنات کے واضح ہونے اور اسی کی بنیاد پر ایک جماعتی نظام کی تفصیلی تشکیل اور اس کے خدوخال کے صفحۂ قرطاس پر مرتسم ہونے میں کم وبیش دس سال کی مدت صرف ہوئی۔ یوں نہ صرف اصولی غور وخوض بلکہ دس سالہ تجربات کی روشنی میں تنظیم اسلامی کے لیے ایک تحریری ''نظام العمل'' کی تسوید وتبییض کا مرحلہ اوائل ۱۹۸۸ء میں شروع ہو سکا' جبکہ تنظیم کی مرکزی

مجلس مشاورت نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲، ۳ مارچ ۱۹۸۸ء میں باضابطہ طے کیا کہ:

''تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لیے بیعت کی اساس اگرچہ دس سال قبل اختیار کر لی گئی تھی لیکن فی زمانہ کسی ہیئتِ اجتماعیہ کے لیے اس مسنون اساس کے متروک العمل ہونے کے باعث تنظیم اسلامی کو بھی اس کے عملی تقاضوں سے کامل ہم آہنگی کے ضمن میں تدریجی مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ اسی ضمن میں اگرچہ متعدد فیصلے مختلف اوقات میں کیے جاتے رہے ہیں لیکن ان کو باضابطہ ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا۔ اسی طرح اگرچہ تنظیم کی قراردادِ تاسیس اور اس کی توضیحات میں بعض تاریخی اسباب کی بنا پر فریضۂ اقامت دین کی اہمیت اور اس کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کے لزوم کے قدرے خفی اور غیر نمایاں ہونے کے پیش نظر تنظیم کے آٹھویں سالانہ اجتماع میں یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ آئندہ تنظیم اسلامی محض اصلاحی اور دعوتی نہیں بلکہ انقلابی تنظیم ہوگی، تاہم ابھی تک یہ بات بھی پوری وضاحت کے ساتھ تحریری طور پر سامنے نہیں آئی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان دونوں اُمور کو مجوزہ نظام العمل میں صراحت کے ساتھ درج کر دیا جائے اور جیسے کہ پانچ سال قبل طے کیا گیا تھا تنظیم اسلامی کی ''قراردادِ تاسیس مع توضیحات'' اور ''شرائطِ شمولیت'' پر مشتمل مفصل تحریر کو آئندہ تنظیم کی آئینی و دستوری اساس نہیں بلکہ اس کے دعوتی اور تربیتی لٹریچر کا اہم اور اساسی حصہ سمجھا جائے۔''

الحمدللہ کہ اندریں اثنا تنظیم کا تفصیلی ''نظام العمل'' تیار ہو کر ''سلسلۂ اشاعت تنظیم اسلامی نمبر۴'' کی حیثیت سے شائع ہو رہا ہے جبکہ پیش نظر کتاب تنظیم کے اساسی نظریات کی وضاحت پر مشتمل ہونے کے ناتے اس کے دعوتی اور تربیتی لٹریچر کا اہم حصہ ہے۔

☆☆☆☆

اس کتاب کے تیسرے اور مختصر ترین حصے میں ''فرائضِ دینی کا جامع تصور'' مختصر ترین الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ یہ راقم الحروف کے عمر بھر کے مطالعۂ قرآن وحدیث اور سنت وسیرتِ رسول (ﷺ) کے خلاصے اور لب لباب کی حیثیت رکھتا ہے اور اس اعتبار سے بلاشبہ تنظیم کے اساسی دینی فکر کا جزوِ لاینفک ہے۔

راقم نے اپنے ان تصورات کے سلسلے میں علماء کرام سے استصواب اور اُن کی آراء سے رفقاء تنظیم کو براہ راست آگاہ کرنے کے لیے یہ اہتمام کیا کہ ۱۹۸۵ء میں تنظیم کا سالانہ اجتماع بھی ۲۳ تا ۲۸ مارچ مسلسل چھ دن جاری رہا اور انہی ایام میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے سالانہ محاضراتِ قرآنی بھی منعقد کر لیے گئے۔ چنانچہ جامع القرآن' قرآن اکیڈمی' ماڈل ٹاؤن لاہور میں صبح کے اوقات میں تنظیم کے سالانہ اجتماع کی کارروائی جاری رہتی تھی اور شام کو تین ساڑھے تین گھنٹے کا اجلاس محاضرات کا ہوتا تھا' جن کا موضوع میری یہی تحریر تھی جس پر تقریباً یک صد علماء کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ ان میں سے پچیس حضرات نے باضابطہ شرکت فرما کر بالمشافہہ خطاب فرمایا اور تقریباً اتنے ہی حضرات نے اپنی آراء تحریری صورت میں ارسال کر دیں۔ چنانچہ روزانہ اوسطاً چار حضرات کا خطاب ہوا جن میں سے بعض نے میرے خیالات کی کامل تصویب فرمائی' بعض نے جزوی اتفاق کا اظہار فرمایا' بعض نے شدید تنقید کی' یہاں تک کہ بعض نے فقرے بھی چست کیے اور مذاق اُڑایا۔ الحمد للہ کہ تنظیم کے لگ بھگ ساڑھے تین سو رفقاء نے جملہ تقاریر کو پورے سکون واطمینان اور کامل توجہ وانہماک کے ساتھ سنا' جس سے بحمد اللہ اُن کے اعتماد ہی میں اضافہ ہوا اور کسی ایک کے دل میں بھی فرائض دینی کے اس جامع تصور کے بارے میں کوئی اشتباہ پیدا نہ ہوا۔

ذاتی طور پر راقم کو ان محاضرات سے دو فائدے حاصل ہوئے۔ ایک تو رواروی میں لکھی ہوئی عبارت میں بعض الفاظ کے بے محل استعمال سے جو مغالطے پیدا ہوئے اُن کی اصلاح کی صورت پیدا ہوگئی۔ دوسرے یہ کہ راقم کو اپنے فکر کی مجموعی تصویب مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ' مولانا مفتی سیاح الدین کاکا خیلؒ' مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری' مولانا سید مظفر حسین ندوی اور ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی ایسے اصحاب علم وفضل سے حاصل ہوئی' جس سے ؏ ''متفق گردید رائے بوعلی با رائے من!'' کے مصداق خود راقم کے اعتماد میں اضافہ ہوا۔ **فجزاھم اللّٰہ عنّی و عن جمیع رفقاء التنظیمِ خیر الجزاء۔** آمین!

اسرار احمد عفی عنہ

تنظیم اسلامی

کی اساسی دعوت

تجدید ایمان	توبہ	تجدید عہد

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
وَالْكِتٰبِ الَّذِىْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ (النساء: ١٣٦)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ا

(التحریم:٨)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِىْ
وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ز

(المائدۃ: ٧)

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِىْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّاىَ فَارْهَبُوْنِo

(البقرۃ: ٤٠)

حصہ اوّل

○

مشتمل بر

قراردادِ تاسیس

مع

توضیحات

(منظور شدہ اجتماعِ رحیم یار خان: ۸،۹ ستمبر ۱۹۶۷ء)

اور

تقاریر مولانا امین احسن اصلاحی و مولانا عبد الغفار حسن

و

تقاریظ مولانا عبد الماجد دریابادیؒ و مولانا عبد الباری ندویؒ

(شائع شدہ ''میثاق'': اکتوبر ۱۹۶۷ء)

قراردادِ تاسیس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری ممد و معاون ہو۔

ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اُسی کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات، دین کا اصل موضوع ہے' اور پیشِ نظر اجتماعیت اصلاً اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے۔

لہٰذا پیشِ نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ اُس میں فرد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا کما حقہٗ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جِلا حاصل ہو' ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے' ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو' عبادات اور اتباعِ سنت سے اُن کا شغف اور ذوق وشوق بڑھتا چلا جائے' عملی زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں اُن کی حس تیز تر اور اُن کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا

جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لیے اُن کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔ اِن تمام اُمور کے لیے ذہنی اور علمی رہنمائی کے ساتھ ساتھ عملی تربیت اور تاثیر صحبت کے اہتمام کی جانب خصوصی توجہ ناگزیر ہے۔

دعوتِ دین کے ضمن میں ہمارے نزدیک ''**الدِّینُ النَّصیحۃُ**'' کی روح اور ''**الاقرب فالاقرب**'' کی تدریج ضروری ہے۔ لہٰذا دعوت و اصلاح کے عمل کو فرد سے اوّلاً کنبہ اور خاندان اور پھر تدریجاً ماحول کی جانب بڑھانا چاہیے۔ اس ضمن میں نئی نسل کی دینی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام ناگزیر ہے۔

عامۃُ النّاس کو دین کی دعوت و تبلیغ کی جو ذمہ داری اُمت مسلمہ پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے' اس کے ضمن میں ہمارے نزدیک اہم ترین کام یہ ہے کہ جاہلیت قدیمہ کے باطل عقائد و رسوم اور دورِ جدید کے گمراہ کن افکار و نظریات کا مدلل ابطال کیا جائے اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کے لیے کتاب و سنت کی ہدایت و رہنمائی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے' تاکہ ان کی اصلی حکمت اور عقلی قدر و قیمت واضح ہو اور وہ شبہات و شکوک رفع ہوں جو اس دَور کے لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔''

توضیحات

قرارداد میں جن اُمور کی وضاحت کی گئی ہے ان میں اوّلین اور اہم ترین امر یہ ہے کہ ''ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔اسی کی اخلاقی اور روحانی تکمیل اور فلاح ونجات' دین کا اصل موضوع ہے اور پیش نظر اجتماعیت اصلاً اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے اصل نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے!''—— اس تصریح کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ ماضی میں مسلمانوں کو ان کی یہ ذمہ داری تو بالکل ٹھیک یاد کرائی گئی کہ جس دین کے وہ مدعی ہیں اسے دنیا میں عملاً قائم کرنے کی سعی و جہد بھی ان پر فرض ہے اور یہ کہ دین محض ذاتی عقائد اور کچھ مراسمِ عبودیت یعنی انسان اور رب کے مابین پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اپنے احاطے میں لینا چاہتا ہے لیکن ان اُمور پر اس قدر زور دیا گیا کہ بندے اور رب کے مابین تعلق کی اہمیت اور افراد کی اپنی علمی' اخلاقی اور رُوحانی ترقی نظر انداز ہوتی چلی گئی۔ آئندہ جو کام پیش نظر ہے اُس کے اُصول ومبادی میں یہ نکتہ بہت زیادہ قابل لحاظ رہے گا کہ ایک مسلمان کا اصل نصب العین صرف نجات اُخروی اور رضائے الٰہی کا حصول ہے اور اس کے لیے اسے اصل زور اپنی سیرت کے تطہیر وتزکیے اور اپنی شخصیت کی تعمیر وتکمیل پر دینا ہوگا' جس سے تعلق مع اللہ اور محبت خدا اور رسول ﷺ میں اضافہ ہوتا رہے اور اس میں زیادہ سے زیادہ اخلاص پیدا ہوتا چلا جائے۔ دین کی تائید ونصرت اور شہادت و اقامت یقیناً فرائض دینی میں سے ہیں لیکن ان کے لیے کوئی ایسی اجتماعی جدوجہد ہرگز جائز نہیں ہے جو افراد کو ان کے اصل نصب العین سے غافل کر کے انہیں محض ایک دُنیوی انقلاب کے کارکن بنا کے رکھ دے! چنانچہ پیش نظر اجتماعیت میں اوّلین زور افراد کی دینی و اخلاقی تربیت پر دیا جائے گا اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے گا کہ ''اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو' ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے' ان کے عقائد کی تصحیح وتطہیر ہو' عبادات اور اتباعِ سنت سے ان کا شغف اور ذوق و

شوق بڑھتا چلا جائے‘ عملی زندگی میں حلال وحرام کے بارے میں ان کی حِس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لیے ان کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔‘‘

’’دینی جذبات کے جِلا‘‘ کے لیے قرآن مجید کی بلا ناغہ تلاوت مع تدبر‘ سیرتِ نبویؐ اور سِیَر الصحابہؓ کا مطالعہ‘ مجالسِ وعظ کا انعقاد‘ باہمی مذاکرۂ آخرت اور مضامین موعظت پر مشتمل آسان لٹریچر کی اشاعت پر زور دیا جائے گا۔

’’علم میں مسلسل اضافے‘‘ کے لیے عربی زبان کی تحصیل کی عام ترغیب اور اس کا اہتمام‘ قرآنِ حکیم اور حدیثِ نبویؐ کے باقاعدہ حلقہ ہائے درس کا قیام اور جاہلیت قدیمہ وجدیدہ پر اسلام کے نقطۂ نظر سے تنقیدی کتب کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا دونوں اُمور سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جاہلیتِ قدیم وجدید دونوں کے اثرات قلوب واذہان سے محو ہوں‘ عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو اور صحیح اسلامی عقائد کی تخم ریزی و آبیاری ہو سکے۔

شرکائے تنظیم کے دینی جذبات کے جِلا اور علم میں اضافے کا براہِ راست اثر عملی زندگی پر پڑے گا اور ان کی زندگیوں میں دینی تبدیلی عملاً پیدا ہوتی چلی جائے گی لیکن اس میدان میں اس امر کی شدید ضرورت ہو گی کہ اس بات کی کڑی نگرانی کی جائے کہ یہ تبدیلی ہمہ جہتی ہو اور اعمالِ انسانی کے مختلف گوشوں میں متناسب انداز میں ظہور پذیر ہو۔ چنانچہ عبادات میں ذوق و شوق‘ معاملات میں احتیاط و تقویٰ اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں میں شغف اور دلچسپی متناسب انداز میں بڑھے۔ یہ صورتِ حال کہ جلسوں کے انعقاد کے ضمن میں تو پابندی بھی ملحوظ رہے اور جوش وخروش کا بھی مظاہرہ کیا جائے لیکن نماز باجماعت کی پابندی گراں محسوس ہو اور نوافل سرے سے خارج از بحث ہو جائیں‘ دین کی نصرت وحمایت کا جذبہ تو ترقی کرتا چلا جائے لیکن تزکیۂ باطن کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے‘ یا سنتِ نبویؐ کی حجیت و اہمیت پر دلائل تو از بر ہوں لیکن خود اپنی زندگی میں اتباعِ نبویؐ کی جھلک نظر نہ آئے‘ نہ صرف یہ کہ افراد کے حق میں سمِّ قاتل ہے بلکہ خود

اجتماعیت کے لیے بھی سخت مُضر اور مہلک ہے —— لہٰذا اس امر کی کڑی نگرانی ضروری ہو گی کہ شرکاء میں عبادات سے شغف' اتباعِ سنت کا جذبہ' معاملات میں حلال وحرام کی حدود و قیود کی پابندی اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں سے دلچسپی توافق و تناسب کے ساتھ بڑھیں۔ خصوصاً یہ احتیاط تو انتہائی لازمی ہو گی کہ پیشِ نظر اجتماعیت کے تنظیمی ڈھانچے میں جو لوگ آگے آئیں وہ تیزی و مستعدی اور نفاست و باقاعدگی سے کام کرنے کی صلاحیت کے اعتبار سے چاہے کسی قدر تہی دست ہوں' عبادات اور اتباعِ سنت کے ذوق وشوق سے ہرگز تہی دامن نہ ہوں۔

شرکائے جماعت میں مندرجہ بالا تبدیلیوں یا بالفاظ دیگر ان کے نفوس کے تزکیہ اور ان کی شخصیت کی دینی تعمیر کے لیے جہاں ذہنی و علمی رہنمائی اور فکری تربیت لازمی و لابدی ہیں وہاں عملی تربیت اور تاثیرِ صحبت کا موثر اہتمام بھی ضروری و ناگزیر ہے۔ اس غرض کے لیے مختلف مقامات پر تربیت گاہوں کا سلسلہ بھی شروع کیا جا سکتا ہے اور ایک ایسی مرکزی تربیت گاہ کا قیام بھی عمل میں لایا جا سکتا ہے جس میں مختلف مقامات کے رفقاء گروپس (groups) کی صورت میں شریک ہوں اور ایک مقررہ میعاد میں انہیں قرآن وحدیث کے منتخب حصص کا درس بھی دیا جائے اور ایک ایسی دینی فضا بھی مہیا کی جائے جس میں ان کے دینی جذبات بھی از سرِ نو تر و تازہ ہوں اور ایک خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کا عملی تجربہ بھی حاصل ہو جائے۔

قرارداد کے بنیادی نکات میں سے دوسرا اہم اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ: ''دعوت کے ضمن میں ہمارے نزدیک ''اَلدِّین النَّصیحة'' کی روح اور ''الاقرب فالاقرب'' کی تدریج ضروری ہے۔'' پیشِ نظر اجتماعیت لازماً یہ چاہے گی کہ اس کا ہر شریک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں داعی الی اللہ اور اپنے ماحول میں حسب مقدور وصلاحیت اور بقدر ہمت و استطاعت ہدایت کا ایک روشن چراغ بن کر رہے اور اس کی شخصیت پر بحیثیت مجموعی داعیانہ رنگ غالب ہو جائے۔

اس دعوت کا اصل محرک ابنائے نوع کی ہمدردی اور نصح و خیر خواہی کا جذبہ ہونا

چاہیے اور اس میں نہ تو اپنی شخصیت کی نمود کا کوئی شائبہ شامل ہونا چاہیے نہ طلب جاہ کا۔ حتیٰ کہ اللہ، رسولؐ اور شریعت کی وفاداری کے جذبے کے تحت اگر کبھی کسی فرد، گروہ یا ادارے پر تنقید کی نوبت آ جائے تو اس میں بھی ہمدردی اور دل سوزی غالب رہے اور ذاتی رنجش یا انتقامِ نفس کا کوئی شائبہ نہ پیدا ہونے پائے۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ ہمارے معاشرے کا مجموعی مزاج اگرچہ دین سے بہت دور جا چکا ہے اور اس اعتبار سے انتہائی اصلاح طلب ہے لیکن دعوت و اصلاح کے عمل میں دو حقائق کا لحاظ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ یہ معاشرہ ایک مجموعی اکائی ہے اور اس کے تمام طبقات میں انحطاط سرایت کر چکا ہے۔ اس اعتبار سے اس کے مختلف طبقات میں کمیت کا تھوڑا بہت فرق چاہے موجود ہو، کوئی بنیادی امتیاز موجود نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ انحطاط براہِ راست نتیجہ ہے جذبات ایمانی کے ضعف اور کتاب و سنت کے علم کی کمی کا۔ اس میں دین دشمنی کا عنصر چند ایسی استثنائی صورتوں کے سوا موجود نہیں ہے جو اگرچہ بجائے خود تو بہت خطرناک ہیں اور ان سے خبردار رہنے کی بھی ضرورت ہے تاہم مجموعی اعتبار سے ہمارے معاشرے کے عام بگاڑ کا اصل سبب دین دشمنی نہیں بلکہ دین سے لاعلمی ہے۔ حکومت اس معاشرے کا جامع عکس اور اربابِ اقتدار اس کا اہم جزو ہیں۔ اُن کو اپنی اہمیت اور معاشرے میں اثر و نفوذ کی قوت و صلاحیت کے اعتبار سے دعوت و تخاطب میں اولیت تو دی جا سکتی ہے اور دی جانی چاہیے لیکن انہیں دین کا دشمن قرار دے کر ان کے خلاف نفرت و عداوت کے جذبات پیدا کرنے کے لیے عوام کے دینی جذبے کو مشتعل کرنا در آں حالیکہ عوام کی ایک عظیم اکثریت کا حال دین سے بے خبری اور عملی بُعد کے اعتبار سے کم و بیش وہی ہے جو اصحابِ قوت و اختیار کا، نہ ان کی خیر خواہی ہے نہ خود دین کی۔ رہا اقتدار کے حصول کی خاطر برسرِ اقتدار طبقے کے مخالف و معاند کی حیثیت اختیار کرنا تو یہ ہمارے نزدیک دینی نقطہ نظر سے نہایت مضر ہی نہیں سخت مہلک ہے جس سے کُلی اجتناب لازمی و لابدی ہے۔ ہمارے نزدیک ''أَئِمَّةُ الْمُسْلِمِين''اور ''عامّتهم'' دونوں ہی نصح و خیر خواہی کے برابر مستحق اور دعوت و اصلاح

کے یکساں محتاج ہیں!

یہاں یہ تصریح بھی ضروری ہے کہ ہماری دانست میں انتخابات کے ذریعے عمومی اصلاح کا نظریہ نری خام خیالی پر مبنی ہے، بحالاتِ موجودہ تو اس امر کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے کہ انتخابات کے ذریعے اصلاح کی اُمید کی جائے۔ ویسے بھی ہماری رائے میں انتخابات میں دوسری جماعتوں کے مخالف و مقابل کی حیثیت سے شرکت' دعوت و اصلاح کے صحیح نہج کے منافی ہے اور اس سے قبولِ حق کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

داعی کے قلب میں اپنے ابنائے نوع کے لیے جس ہمدردی اور نصح و خیر خواہی کا ہونا لازمی ہے' اسی کا ایک اہم مظہر رافت و رحمت اور شفقت و رقت کا وہ جذبہ ہے جو ابنائے نوع کو تکلیف اور مصیبت میں دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور عملی زندگی میں خدمتِ خلق اور ایثار و انفاق کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ دعوت دین اور خدمت خلق کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں بلکہ بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین کا وہ داعی جو خادم خلق نہ ہو اپنی دعوت میں دولت اخلاص سے محروم ہے۔ اس ضمن میں یہ فرق البتہ ضرور پیش نظر رہنا چاہیے کہ خدمت خلق کی اجتماعی سکیموں کو زیرِ عمل لانا بالکل دوسری بات ہے اور افراد میں خدمت خلق کے جذبے کا پیدا ہونا اور بڑھنا بالکل دوسری چیز ہے۔ خدمت خلق کی اجتماعی سکیموں کی اہمیت اپنی جگہ کتنی ہی مسلم ہو' دعوت دین کے نقطہ نظر سے اصل مطلوب افراد کے قلوب میں شفقت و رحمت کے جذبے اور عمل میں ایثار و انفاق کی کیفیت کا ظہور ہے۔ پیش نظر اجتماعیت میں اصل زور اِن شاء اللہ اسی پر دیا جائے گا۔

دعوت کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کا تخاطب لازماً ایک تدریج کے ساتھ داعی کے اپنے نفس سے شروع ہو کر ﴿عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ اپنے اہل وعیال ﴿قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ اور کنبے قبیلے ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ سے ہوتے ہوئے اپنی قوم ﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ﴾ اور پھر پوری انسانیت ﴿لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ تک پہنچنا چاہیے۔ ہمارے

نزدیک یہ صورت کہ داعی اپنے آپ کو بھول جائے اور برّ وتقویٰ کی ساری دعوت دوسروں کو دیتا رہے ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ﴾ یا اپنے خاندان اور کنبے قبیلے کو تو بھول جائے اور دور دراز کے لوگوں میں ہدایت کی سوغات بانٹنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو' نہایت خطرناک مرض کی علامت ہے۔ دعوت کے عمل کا صحیح نہج یہ ہے کہ ''اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ'' کے اصول پر آگے بڑھے اور جس سے جتنی قربت اور محبت داعی کو ہو دعوت وتخاطب میں اسی قدر اسے مقدم رکھا جائے۔ اس سلسلے میں یہ خیال البتہ صحیح نہ ہوگا کہ ایک مرحلے کی تکمیل کے بعد ہی دوسرا مرحلہ شروع کیا جائے۔ مطلوب صرف یہ ہے کہ دعوت کے عمل کو ایک فطری تدریج اور حسین تناسب کے ساتھ اپنی ذات' اہل و عیال' کنبے قبیلے اور پھر عوام الناس تک بڑھنا چاہیے۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنی اولاد اور فی الجملہ نئی نسل کے بارے میں خصوصی توجہ و اہتمام سے کام لینا ہوگا' اس لیے کہ ان کے بارے میں ہم حدیث نبویؐ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّکُلُّکُمْ مَّسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ ...الخ کی رو سے براہِ راست مسئول اور ذمہ دار ہیں۔ اولاد کی دینی تعلیم وتربیت کا یہ اہتمام ذاتی وانفرادی بھی ہوگا اور جہاں جہاں ممکن ہوگا اور وسائل دستیاب ہوسکیں گے اس امر کی سعی بھی کی جائے گی کہ ایسے مدارس اپنے اہتمام میں قائم کیے جائیں جن میں نئی نسل کے قلوب واذہان میں ایمان کی تخم ریزی و آبیاری اور اخلاقی وعملی تربیت کا بندوبست کیا جائے۔

وسائل دعوت کے ضمن میں کوئی تعین غیر ضروری ہے۔ حسب صلاحیت واستعداد انفرادی ونجی گفتگو' خطاب ہائے عام' خطباتِ جمعہ اور دروسِ قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف اور نشر واشاعت کے تمام جدید طریقوں کو اختیار کیا جاسکتا ہے!

قرارداد کا تیسرا اہم نکتہ ''عامۃ الناس کو دین کی دعوت وتبلیغ'' کی اس ذمہ داری سے بحث کرتا ہے جو ''امت مسلمہ پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے''۔ ہمارے نزدیک انذار وتبشیر' دعوت وتبلیغ اور شہادتِ حق علی الناس کی جو ذمہ داریاں انبیائے کرام علیہم السلام پر عائد ہوا کرتی تھیں' وہ اب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کے ختم

ہو جانے کے بعد آپؐ کی اُمت پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہیں۔ اوّل اوّل اس اُمت نے ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کے نظام کے تحت اپنی اس ذمہ داری کو اجتماعی حیثیت سے ادا کیا۔ اس کے خاتمے کے بعد بھی ایک عرصے تک مسلمان حکومتیں اِس فرضِ منصبی کو ادا کرتی رہیں۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اتقیاء وصلحاء ذاتی طور پر دُور دراز علاقوں میں پہنچ کر دین کی دعوت وتبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ ادھر عرصے سے یہ سلسلہ بھی تقریباً ختم ہو چکا ہے اور اُمتِ مسلمہ بحیثیت مجموعی ''کتمانِ حق'' کے جرم کی مرتکب ہو رہی ہے اور صورتِ حال یہ ہے کہ اُمت کی تمام اجتماعی سرگرمیاں صرف اپنے دفاع اور دُنیوی ترقی واستحکام تک محدود ہیں۔ کچھ تھوڑا بہت دینی رنگ کسی اجتماعی سرگرمی میں ہے بھی تو وہ محض اُمت کی داخلی اصلاح کی حد تک ہے۔ ہمارے نزدیک یہ صورتِ حال سخت تشویش ناک ہے اور اس سے نہ صرف یہ کہ اُخروی باز پُرس کا اندیشہ ہے' بلکہ ہماری رائے میں ہماری دنیوی نکبت وذلّت کا اصل سبب بھی یہی ہے!

اس ضمن میں ہمارے نزدیک اس وقت کرنے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ ایک طرف ادیانِ باطلہ کے مزعومہ عقائد کا مؤثر ومدلل ابطال کیا جائے اور دوسری طرف مغربی فلسفہ وفکر اور اس کے لائے ہوئے زندقہ والحاد اور مادہ پرستی کے سیلاب کا رُخ موڑنے کی کوشش کی جائے اور حکمتِ قرآنی کی روشنی میں ایک ایسی زبردست جوابی علمی تحریک برپا کی جائے جو توحید' معاد اور رسالت کے بنیادی حقائق کی حقانیت کو بھی مبرہن کر دے اور انسانی زندگی کے لیے دین کی رہنمائی وہدایت کو بھی مدلل ومفصل واضح کر دے۔ ہمارے نزدیک اسلام کے حلقے میں نئی اقوام کا داخلہ اور جسدِ دین میں نئے خون کی پیدائش ہی نہیں' خود اسلام کے موجود الوقت حلقہ بگوشوں میں حرارتِ ایمانی کی تازگی اور دین وشریعت کی عملی پابندی اسی کام کے ایک مؤثر حد تک تکمیل پذیر ہونے پر موقوف ہے' اس لیے کہ دورِ جدید کے گمراہ کن افکار ونظریات کے سیلاب میں خود مسلمانوں کے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بڑی تعداد اس طرح بہہ نکلی ہے کہ ان کا ایمان بالکل بے جان اور دین سے ان کا تعلق محض برائے نام رہ گیا ہے اور اسی بنا پر دین میں نت نئے فتنے اُٹھ

رہے ہیں اور ضلالت وگمراہی نت نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہو رہی ہے۔

اس سلسلے میں انفرادی کوششیں تو اب بھی جیسی کچھ بھی عملاً ممکن ہیں' جاری ہیں اور آئندہ بھی جاری رہیں گی۔ضرورت اس کی داعی ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو وسائل فراہم کیے جائیں اور ایک ایسے باقاعدہ ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جو حکمتِ قرآنی اور علمِ دینی کی نشر واشاعت کا کام بھی کرے اور ایسے نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کا بھی مناسب اور مؤثر بندوبست کرے جو عربی زبان' قرآن حکیم اور شریعتِ اسلامی کا گہرا علم حاصل کر کے اسلامی اعتقادات کی حقانیت کو بھی ثابت کریں اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے جو ہدایات اسلام نے دی ہیں انہیں بھی ایسے انداز میں پیش کریں جو موجودہ اذہان کو اپیل کر سکے۔

آخر میں اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیشِ نظر تنظیم ہرگز ''الجماعت'' کے حکم میں نہ ہوگی۔الجماعہ کا مقام ہماری دانست میں اُمتِ مسلمہ کو بحیثیت مجموعی حاصل ہے۔پیشِ نظر اجتماعیت کی حیثیت مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم کی ہوگی جس میں وہ لوگ شریک ہوں گے جو خود اصلاحِ نفس اور تعمیر سیرت کے خواہش مند ہوں اور ان جملہ انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا چاہیں جو دین کی جانب سے ان پر عائد ہوتی ہیں تاکہ ایک طرف اُن کا باہمی تعاون ایک دوسرے کے لیے سہارا بن سکے اور دوسری طرف اصلاحِ معاشرہ کے لیے ایک مؤثر قوت فراہم ہو جائے۔دین کی خدمت نہایت وسیع وعظیم کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ ان کے ساتھ ہمارا رویہ تعاون وتائید ہی کا ہوگا۔اپنے فہم وفکر کے مطابق ہم بھی دین کی خدمت کی ایک ادنیٰ کوشش کے لیے جمع ہو رہے ہیں اور یہ توقع کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ دین کے تمام خادم ہمیں اپنے رفیقِ راہ ہی گردانیں گے —— اس تصریح کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ ہم واقعۃً تمام دینی عناصر خصوصاً علمائے کرام کے تعاون کی شدید احتیاج محسوس کرتے ہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ○

تقریر مولانا امین احسن اصلاحی

خطبۂ مسنونہ کے بعد؛

بھائیو اور دوستو!

ایک طویل مدت کے بعد ہم خیال و ہم مقصد دوستوں کی صحبت جو میسر آئی ہے تو معلوم نہیں دل کے کتنے گوشے ہیں جن کے دریچے کھل گئے ہیں اور کتنے سوئے ہوئے خیالات ہیں جو جاگ پڑے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ساری باتوں کو ایک صحبت میں کہہ ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ یہ تو جب بھی کہی جائیں گی مختلف قسطوں ہی میں کہی جائیں گی۔ اس وقت تو صورتِ حال یہ ہے کہ سِرا نہیں مل رہا ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔ کیا بات کہی جائے' کیا نہ کہی جائے اور شروع کر کے بات کہاں ختم کی جائے۔ اِس اُلجھن کی وجہ سے آپ مجھے اجازت دیجیے کہ میں گفتگو صرف اس قرارداد کی وضاحت تک محدود رکھوں جو اپنے پورے مالہٗ اور ماعلیہ کے ساتھ آپ کے سامنے آ چکی ہے۔

اس قرارداد کی وضاحت کرنے میں اِس وجہ سے نہیں اٹھا کہ اِس میں کوئی ابہام و اجمال ہے۔ یہ اپنے مقصد و مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ جس طرح میں نے اس کو سمجھ لیا ہے اسی طرح آپ نے بھی اس کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ میری اس وضاحت کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس میں جو نصب العین اور جو طریقۂ کار اپنانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے بعض دلائل آپ کے سامنے عرض کروں تا کہ اس کی پوری اہمیت آپ کے سامنے آ جائے۔

ہم نے اس قرارداد میں اللہ کا نام لے کر ایک ایسی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا ہے ''جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری مدد کرے!''——قرارداد کا یہ جملہ دو اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ایک اس حقیقت کی طرف کہ آپ تنظیم کو بجائے خود غایت و مقصد نہیں سمجھتے بلکہ اس کو صرف دین کی عائد کردہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اپنے لیے ممدّ و معاون سمجھتے ہیں۔ دوسرے اس بات کی طرف کہ آپ اپنا نصب العین دین کو سمجھتے ہیں اور اس دین کو اپنی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں پر حاوی مانتے ہیں۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ درحقیقت ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہی ہے۔ وہ خطرہ یہ ہے کہ جماعتیں اور تنظیمیں قائم تو ہوتی ہیں اصلاً کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لیے' لیکن قائم ہو جانے کے بعد آہستہ آہستہ وہ خود نصب العین اور مقصد بن جاتی ہیں' اور اصل نصب العین غائب ہو جاتا ہے۔ آپ کو اس خطرے سے ہر قدم پر ہوشیار رہنا ہے۔ اس چیز نے نہ صرف جماعتوں اور تنظیموں کو تباہ کیا ہے' بلکہ ملتوں اور اُمتوں کو بھی بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اِس تغیر کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ اصل مقصد غائب ہو جاتا ہے بلکہ مقصد وسیلہ اور ذریعہ کا ایک ادنیٰ خادم اور چاکر بن کے رہ جاتا ہے۔ پھر تنظیم مقصد کی خدمت نہیں کرتی بلکہ مقصد کو اپنی خدمت اور اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی ہے۔ مذہب کے نام قائم ہونے والی جماعتوں کے لیے یہ چیز خاص طور پر خطرناک ہے' اس لیے کہ جب اس طرح کی کوئی جماعت خود اپنے وجود اور اُس کے قیام و بقا کو مقصود بنا لیتی ہے تو وہ مذہب کی بھی جن چیزوں کو اپنے اِس مقصد کی راہ میں مزاحم پاتی ہے' اُن کو بدل کر اپنے جماعتی اغراض کے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ مذاہب کی تاریخ ایک ساتھ شہادت دیتی ہے کہ اس چیز نے بے شمار تحریفات کی راہیں کھولی ہیں اور اس سے بڑے فتنے ظہور میں آئے ہیں۔ اس خطرے کے پیشِ نظر اس قرارداد میں اس امر کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ تنظیم بجائے خود غایت و مقصد نہ بننے پائے بلکہ وہ اصل مقصد کے وسیلہ و ذریعہ کی حد تک محدود رہے۔ قرارداد کے اس پہلو پر بہت سی باتیں کہنی ہیں جو آگے کے مراحل میں بتدریج آپ کے سامنے آئیں گی۔ اس کے لیے لازماً اس کے تنظیمی ڈھانچہ میں ایسی حد بندیاں کرنی پڑیں گی جو اس کو بے راہ روی اور گمراہی سے محفوظ رکھیں۔

جہاں تک دوسری چیز یعنی دین ہی کو نصب العین بنانے کا تعلق ہے یہ کم از کم ہمارے اور آپ کے لیے محتاجِ دلیل نہیں۔ ہم خدا کے فضل سے مسلمان ہیں اور ہمارا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ انسانیت کی اصل ترقی و فلاح مذہب کے ساتھ وابستہ ہے۔ مذہب کے بغیر انسان بس ایک ترقی یافتہ حیوان ہے' جیسا کہ نظریۂ ارتقاء کے قائلین کہتے ہیں' یا زیادہ سے زیادہ ایک حیوانِ ناطق جیسا کہ ارسطو نے انسان کی تعریف کی ہے۔ ہم ان دونوں میں سے کسی تعریف کو بھی انسان کی صحیح تعریف نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک انسان ایک رُوحِ یزدانی کا حامل ہے' جیسا کہ قرآن نے ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ کے الفاظ سے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہی رُوحِ یزدانی ہے جو انسان کا شرفِ خصوصی ہے اور اسی کی بدولت انسان مسجودِ ملائک بنا ہے۔

یہی رُوحِ ملکوتی اگر انسان کی رُوحِ بہیمی پر غالب رہے تو انسان حقیقی انسان ہے ورنہ وہ بس دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہے۔ اس رُوحِ ملکوتی کے رُوحِ بہیمی پر غالب رہنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے ارادے کی باگ خدا کی شریعت کے ہاتھ میں ہو۔ اگر انسان کا ارادہ شریعت کے ہاتھ میں نہ ہو اور اس کی عقل خدا کی وحی سے رہنمائی حاصل نہ کرے تو جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ کپڑوں میں ملبوس ایک جانور ہے۔ یہ جانور گدھا بھی ہوسکتا ہے' کتا بھی ہوسکتا ہے اور بندر اور خنزیر اور ایک خوفناک درندہ بھی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے شریعت سے بے قید انسان کو مذکورہ تمام جانوروں سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ تشبیہہ محض برائے تشبیہہ نہیں ہے بلکہ اظہارِ حقیقت ہے۔ اگر ہمارے پاس حقیقت کو دیکھنے والی آنکھیں ہوتیں تو ہم اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ہمارے متمدن شہروں میں کپڑوں میں ملبوس کتنے چوپائے اور درندے انسانوں کے بھیس میں پھر رہے ہیں' اور اس صفحۂ ارضی پر قوموں کی قومیں ہیں جو متمدن کہلانے کے باوجود اپنی سرشت کے اعتبار سے درندوں سے زیادہ سفاک اور خونخوار بن گئی ہیں۔

ہمارے لیے شریعت کے انتخاب کا معاملہ بھی کوئی پیچیدہ معاملہ نہیں ہے۔ ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام تمام دنیا کا مشترک دین ہے اور قرآن خدا کی آخری اور کامل کتاب' اور محمد رسول اللہ ﷺ خدا کے آخری رسول ہیں۔ اس وجہ سے یہ عین ہمارے عقیدے کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی زندگی اسلام کے احکام وہدایت کے تحت گزاریں اور اسی کی دعوت دوسروں کو بھی دیں۔

یہ دوسروں کو دعوت دینا بھی عین ہماری فطرتِ بشری کا اقتضاء اور ہماری اپنی اصلاح اور ترقی کا لازمہ ہے۔ آپ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوسکتے کہ انسان تنہا نہیں پایا جاتا' وہ ایک مدنی الطبع ہستی ہے۔ وہ کسی خاندان کے فرد' کسی قبیلہ کے رکن' کسی شہر کے شہری اور کسی ملک کے باشندے کی حیثیت سے پایا جاتا ہے اور اپنی فطری صلاحیتوں کے پروان چڑھنے کے لیے وہ ان سب باتوں کا محتاج ہے۔ اسی بنا پر انسان کو Social Animal کہا گیا ہے۔ جس طرح مچھلی پانی سے مستغنی نہیں ہوسکتی' اسی طرح انسان معاشرے سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ اگر انسان معاشرے سے بے تعلق ہو کر اپنی صلاحیتوں کو صحیح طور پر اُجاگر کرسکتا تو اسلام رہبانیت کی ممانعت نہ کرتا۔ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے نباتات میں سے Creepers سے مشابہ ہے۔ جس طرح انگور کی بیل صحیح طور پر اسی طرح پروان چڑھتی ہے جب اس کو کوئی سہارا ملے' بغیر اس سہارے کے وہ سکڑ کر رہ جاتی ہے اسی طرح انسان بھی صحیح طور پر اسی طرح پروان

چڑھتا ہے جب اس کو معاشرے کا سہارا ملے' بغیر اس سہارے کے اس کی صلاحیتیں سکڑ کے رہ جاتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ضروری ہے کہ یہ سہارا اس کے روحانی تقاضوں کے موافق ہو۔ جس طرح انگور کی بیل اس سہارے کے اثرات میں سے حصہ لیتی ہے جس پر وہ چڑھتی ہے' اسی طرح انسان اس معاشرے کے خیر وشر سے متاثر ہوتا ہے جس میں زندگی گزارتا ہے۔ انگور کی بیل کو نیم پر چڑھا دیجیے تو اس کے پھل کڑوے کسیلے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان اگر برے معاشرے میں زندگی گزارے تو وہ برا بن سکتا ہے۔

انسان کی اس فطرت نے اس کے لیے ایک سخت مشکل پیدا کر دی ہے۔ ایک طرف تو اس کی فطرت کی رُو سے یہ واجب ہے کہ وہ اپنے لیے سازگار معاشرہ تلاش کرے اور اگر معاشرہ سازگار نہ ہو تو اپنے روحانی و اخلاقی تقاضوں کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ اس کو سازگار بنانے کی جدوجہد کرے۔ اگر کوئی شخص یہ جدوجہد نہ کرے تو اس کی اخلاقی و رُوحانی موت یقینی ہے۔ اگرچہ کوئی شخص کسی دوسرے کی اصلاح پر اختیار نہیں رکھتا' دوسرے کی اصلاح اللہ کی توفیق پر منحصر ہے' لیکن ہر شخص خود اپنی اصلاح کے لیے اس جدوجہد پر اپنے امکان اور اپنی صلاحیتوں کی حد تک مامور ہے۔

اس وجہ سے ہمارے پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے اُس پر واجب ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کرے' اگر اس کی قدرت رکھتا ہو۔ اگر ہاتھ سے اس کی اصلاح کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی اصلاح کی کوشش کرے' اگر اس کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر اس کی بھی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو ادنیٰ درجہ کا ایمان یہ ہے کہ اس کو دل سے بُرا جانے (یعنی اس میں کسی نوعیت سے بھی تعاون نہ کرے)! اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

معاشرہ سے متعلق افراد کی ذمہ داریوں کو واضح کرنے کے لیے حضور ﷺ نے معاشرہ اور افراد کو ایک کشتی کے مسافر سے تشبیہہ دی ہے۔ ایک کشتی میں کچھ لوگ عرشے پر سفر کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس کے نیچے کے حصے میں۔ فرض کیجیے نیچے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں پانی لینے کے لیے اُوپر جانے کی مشقت اُٹھانی پڑتی ہے' کیوں نہ ہم اپنے حصے میں کشتی کے پیندے میں سوراخ کر لیں' اور اوپر والے یہ خیال کر کے کہ وہ اپنے حصے کی کشتی میں سوراخ

کرر ہے ہیں' ان کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سوراخ کرنے کے لیے ان کو آزاد چھوڑ دیں تو سوراخ ہو جانے کے بعد کشتی جو ڈوبے گی تو اُوپر والوں اور نیچے والوں سب کو لے کر ڈوبے گی۔ یہی حال معاشرے کا ہے۔اس میں اچھے بھی ہوتے ہیں' بُرے بھی۔ اگر اچھے لوگ معاشرے کے خیر و شر سے بے تعلق ہو جاتے ہیں تو بروں کی برائی سے جو آفت ظہور میں آتی ہے اس میں اچھے اور بُرے دونوں ہی حصہ پاتے ہیں۔

حدیثوں میں ایک بستی کا ماجرا بھی بیان ہوا ہے' جس سے یہ حقیقت مزید واضح ہوتی ہے۔ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کے متعلق فرشتہ کو حکم دیا کہ جا کر اُس کو اُلٹ دو۔فرشتہ نے عرض کی کہ باری تعالیٰ اس میں تو تیرا ایک ایسا بندہ بھی ہے جو برابر تیری عبادت میں لگا رہتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کے سمیت بستی کو اُلٹ دو' اس لیے کہ اُس کا چہرہ کبھی میرے دین کی بے حرمتی پر غیرت سے تمتمایا نہیں۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ہمارے لیے اپنے معاشرے کے خیر و شر سے بے تعلق رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نہ ہماری فطرت اس بے تعلقی کی روادار ہے' نہ ہمارا مذہب اِس کی اجازت دیتا ہے۔دوسروں کی اصلاح سے قطع نظر ہم خود اپنی اصلاح وفلاح کے لیے اِس بات کے محتاج ہیں کہ اپنے معاشرے کو اپنے رُوحانی و اخلاقی تقاضوں کے لیے سازگار بنانے کی کوشش کریں۔ اِس کوشش سے دوسروں کی اصلاح ہو یا نہ ہو' لیکن ہماری اصلاح ہو گی۔ اِس سے ہماری اپنی صلاحیتیں پروان چڑھیں گی اور ہماری اپنی فطرت کے مضمرات بروئے کار آئیں گے۔ جو شخص یہ کام کرتا ہے وہ خود اپنا فرض انجام دیتا ہے اور دوسروں سے زیادہ وہ خود اپنے اُوپر احسان کرتا ہے۔اس وجہ سے اگر کوئی شخص یہ فرض انجام دیتا ہے تو اُس کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو معاشرے کا محسن سمجھنے لگے بلکہ وہ یہ سمجھے کہ اُس نے اپنا ہی فرض انجام دیا ہے۔ جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں تو کسی پر احسان نہیں کرتے بلکہ خود اپنے اُوپر احسان کرتے ہیں اسی طرح اگر ہم معاشرے کی کسی بُرائی کی اصلاح کرتے ہیں تو کسی پر احسان نہیں کرتے بلکہ صرف اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ دین میں دوسروں کے نیک و بد سے متعلق ہم پر جو ذمہ داری عائد کی گئی ہے وہ ہمارے ذاتی فرض ہی کی حیثیت سے عائد کی گئی ہے۔

زیرِ بحث قرارداد میں یہ تصور اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے اور اس کے دو بڑے اہم فائدے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کوئی شخص دعوت و اصلاح کا کوئی کام کرتے ہوئے یہ نہیں سمجھے گا

کہ وہ کسی دوسرے کا کام کر رہا ہے‘ بلکہ وہ یہی سمجھے گا کہ اپنا ہی کام کر رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ کوئی شخص دوسروں کی اصلاح میں اتنا مستغرق نہیں ہوگا کہ وہ خود اپنی اصلاح سے غافل اور بے پروا ہو جائے۔ یاد رکھیے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دوسروں کی اصلاح کی کوشش اصلاً خود اپنی ہی اصلاح کی کوشش کا ایک حصہ ہے۔ جو شخص دوسروں کی اصلاح میں رات دن سرگرم رہتا ہے لیکن اسے خود اپنی اصلاح کی فکر نہیں ہے‘ وہ محض نمائشی مصلح ہے۔ جو خود بھٹک رہا ہو وہ دوسروں کی رہبری نہیں کر سکتا۔ انگور کی وہ بیل سوکھ جاتی ہے جس کی اپنی جڑ اُکھڑی ہوئی ہو‘ اگرچہ اس کو کتنے ہی خوبصورت سہارے پر چڑھا دیجیے۔ اس زمانے میں چونکہ زیادہ تر مدعیانِ اصلاح ایسے ہی ہیں جنہیں خود اپنے دین و ایمان کا کچھ ہوش نہیں لیکن دوسروں میں دین کی سوغات بانٹنے کے لیے خشکی و تری کا سفر کرتے پھرتے ہیں‘ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اصل نقطہ پر لوگوں کی توجہ مرکوز کرائی جائے۔ چنانچہ قرارداد میں اِس حقیقت کو یوں واضح کیا گیا ہے کہ:

’’ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اُسی کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات دین کا اصل موضوع ہے اور پیشِ نظر اجتماعیت اصلاً اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے۔‘‘

اس تصور کا قدرتی مطالبہ یہ ہے کہ اس تنظیم کا ڈھانچہ ایسا بنایا جائے کہ وہ اپنے اعضاء و ارکان کی اصلاح و تربیت کا ایک جامع ادارہ بن جائے۔ اس عزم کا اظہار قرارداد میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

> ’’لہٰذا پیشِ نظر اِجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ اُس میں فرد کی دینی و اخلاقی تربیت کا کما حقہٗ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جِلا حاصل ہو‘ ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے‘ ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو‘ عبادات اور اتباعِ سنت سے اُن کا شغف اور ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے‘ عملی زندگی میں حرام و حلال کے بارے میں اُن کی حس تیز اور اُن کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لیے اُن کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔‘‘

اِن تمام مقاصد کے حصول کے لیے تنظیم کیا وسائل و ذرائع اختیار کرے گی؟ اس کا جواب دینا بروقت میرے لیے مشکل ہے۔ اِس کا جواب بہت کچھ منحصر ہے اس بات پر کہ اس

تنظیم کو کن صلاحیتوں کے افراد حاصل ہوتے ہیں اور وہ اپنی مجموعی کوشش سے کیا اسباب و وسائل فراہم کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ افراد اور وسائل کی وسعت کے ساتھ ساتھ امکانات کا جائزہ لینا اور ان کے مطابق قدم اٹھانا تنظیم کے اربابِ حل وعقد کا کام ہے لیکن اتنی بات بدیہی ہے کہ اس مقصد کے بروئے کار لانے میں اس امر کی پوری کوشش کی جائے گی کہ جو قدم بھی اُٹھے اسوۂ انبیاء کی روشنی میں اُٹھے اور جماعت کی تربیت اس نہج پر ہو جس کی طرف کتاب و سنت میں رہنمائی کی گئی ہے۔

ہم اپنی تربیت کے لیے سب سے پہلے تو صحیح علم کے محتاج ہیں۔ صحیح علم سے میری مراد دین کا علم ہے۔ اس زمانے میں دین کا علم عنقا ہو رہا ہے' اس کے حصول کے لیے وسائل و ذرائع بھی روز بروز کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں اور لوگوں کے اندر اس کی رغبت بھی بالکل ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اگر دین کا علم ہی مٹ گیا تو پھر دین کے باقی رہنے کا کیا امکان ہے؟ یہ امر بھی بدیہی ہے کہ اِس زمانے میں دین کا روایتی علم بالکل غیر مفید ہے۔ یہ زمانہ عقلیت کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں لوگ ہر چیز کی دلیل و حجت کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ مجرد یہ بات لوگوں کو اپیل نہیں کرتی کہ فلاں بات دین کی بات ہے۔ دین پر آج جو اعتراضات ہو رہے ہیں' وہ کل کے اعتراضات سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ اعتراضات جدید مغربی فکر و فلسفہ کی پیداوار ہیں اور ان کو زور و قوت کے ساتھ پھیلانے والے خود ہمارے اندر پیدا ہو گئے ہیں۔ جب تک ان اعتراضات وشبہات کا مؤثر ازالہ نہ ہو اس وقت تک ممکن نہیں ہے کہ آپ دین کی کوئی مفید خدمت انجام دے سکیں۔ افسوس ہے کہ اس خدمت کی صلاحیت رکھنے والے آج ہمارے اندر اگر مفقود نہیں تو اتنے کم ہیں کہ وہ دین کے محاذ کو کسی طرح بھی سنبھال نہیں سکتے۔ اس وجہ سے وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے حاملانِ دین پیدا کرنے کی مؤثر جد جہد کی جائے جو جدید علوم وافکار سے بھی کما حقہٗ آگاہ ہوں اور کتاب وسنت کے دلائل و براہین پر بھی وہ براہِ راست نظر رکھتے ہوں۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہمارا دین دنیا میں بے دلیل نہیں آیا ہے۔ وہ بہتر سے بہتر فطری و عقلی دلائل سے مسلح ہو کر آیا ہے جو ہر دور کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہیں' بشرطیکہ ان کو اُجاگر کرنے والے اور اُن کو دنیا کے سامنے حالات کے مطابق پیش کرنے والے موجود ہوں۔ دوستو! یہ کام کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس قسم کے افراد صرف اُردو میں لکھی ہوئی چند کتابیں پڑھ لینے سے نہیں پیدا ہوں گے' بلکہ اس کے لیے

کتاب وسنت اور علومِ اسلامیہ سے براہِ راست گہری واقفیت ضروری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی صلاحیت ہم میں سے ہر شخص اپنے اندر نہیں پیدا کرسکتا، لیکن معتد بہ تعداد ہمارے اندر جب تک ایسے لوگوں کی نہ ہوگی ہم ان ذمہ داریوں سے کماحقہ عہدہ برآ نہ ہوسکیں گے جو دین سے متعلق اس زمانے میں ہم پر عائد ہوتی ہیں۔

جہاں تک عامۃ المسلمین کو دین کی دعوت دینے کا تعلق ہے، اِس کے بارے میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اِس زمانے میں مجرد تذکیر کافی نہیں ہے، بلکہ وسیع پیمانے پر تعلیم وتفہیم کی ضرورت ہے۔ یہ صورت نہیں ہے کہ لوگ دین کی باتیں بھولے ہوئے ہیں، اگر انہیں یاد دِلا دی جائیں تو وہ ان کو اختیار کرلیں گے، بلکہ اشاعتِ باطل کے وسیع ذرائع نے اِس زمانے میں عام اذہان کے اندر بھی دین اور دینی احکام سے متعلق بے شمار غلط فہمیاں بھر دی ہیں جن کے دُور کرنے کا سامان کرنا ان لوگوں پر واجب ہے جو آج ملک کے عوام کی اس پہلو سے کوئی خدمت کرنا چاہتے ہوں۔ آج اخبارات گھر گھر پہنچ رہے ہیں۔ ریڈیو کھیتوں اور کھلیانوں تک موجود ہے۔ اس وجہ سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ زندگی کے جدید شیطانی نظریات سے ہمارے عوام بے خبر ہیں یا وہ ان سے بالکل بے تعلق ہیں۔ ان سے تاثر کے معاملے میں شہری اور دیہاتی آبادی میں کچھ فرق ہونا تو ایک قدرتی امر ہے لیکن دیہاتی آبادی کو ان فتنوں سے بالکل الگ تھلگ خیال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اِس وجہ سے ان کے اندر کام کرنے کے وہ طریقے اختیار کرنے ہوں گے جو موجودہ حالات میں اُن کے لیے مؤثر اور مفید ہوں۔

جہاں تک ملک کے اربابِ اقتدار کا تعلق ہے، اُن کے بارے میں بھی ہمارے ہاں سخت افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو اُن کی اصلاح کے معاملے میں بالکل بے تعلق ہیں، انہیں اُن کے خیر وشر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو ان کے شر کو بھی خیر ہی کہنا پسند کرتے ہیں۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو اُن کے خیر کو بھی شر قرار دیتے ہیں اور ہر حالت میں اُن کی مخالفت کرنا اُن کے ہاں جزوِ ایمان ہے۔

آپ کی یہ قرارداد اِن تینوں طریقوں کو غلط قرار دیتی ہے اور دین کی روشنی میں ایک چوتھا طریقہ آپ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ جہاں تک پہلے طریقے یعنی لاتعلقی کے رویہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ میں عرض کرچکا ہوں کہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کوئی پرایا جھگڑا نہیں ہے جس سے علیحدہ رہنے میں آدمی کے لیے سعادت ہو بلکہ

ہم میں سے ہر شخص کے اپنے دین و ایمان کا معاملہ ہے۔ میں پیغمبر ﷺ کی واضح تعلیمات کی روشنی میں بتا چکا ہوں کہ جو شخص معاشرے کے خیر و شر سے بے پروا ہے وہ خود اپنے دین و ایمان سے بے پروا ہے اور اُس کی یہ بے پروائی اُس کی ساری دینداری غارت کر کے رکھ دے گی۔ ہم جس کشتی پر سوار ہیں اپنے امکان کی حد تک کسی کو اس کے پیندے میں سوراخ کرتے ایک تماشائی کی طرح نہیں دیکھ سکتے۔

دوسرے گروہ کا رویہ بھی بالکل غلط ہے۔ جو چیز غلط ہے' اگر وہ اربابِ اقتدار کی طرف سے ظہور میں آئے تو اُس کی غلطی اور بھی سنگین ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس کے اثرات بہت دُوررس ہوں گے۔ اگر کوئی شخص اس غلطی کو صواب قرار دے تو یہ اُس پر خاموش رہنے سے بھی بڑا جرم ہے۔ یہ رویہ اگر خوف یا طمع کی بنا پر اختیار کیا جائے تو اسلام میں صریح نفاق ہے' جو ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا اور اگر یہ اس بنیاد پر اختیار کیا جائے کہ اس سے حکومت کو ضعف پہنچتا ہے تو یہ بھی غلط ہے۔ اول تو حکومت کو ضعف پہنچ سکتا ہے تو غلط چیز سے نہ کہ صحیح چیز سے' ثانیاً حکومت بجائے خود مقصد و غایت نہیں ہے بلکہ اسلام میں وہ اللہ کے قانونِ عدل و قسط کا ذریعہ ہے۔ اس وجہ سے حکومت کی مصلحت کے لیے بھی کسی شر کو خیر قرار دینا اپنے دین و ایمان پر کلہاڑی مارنا ہے۔

تیسرے گروہ کا رویہ بھی بالکل غلط ہے۔ اربابِ اختیار کی ہر بات کو ہدفِ تنقید بنا لینا یہاں تک کہ اُن کے خیر کو بھی شر قرار دینا اور اُس کی مخالفت میں اِس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی بُرائیاں بھی اُن کے کھاتے میں ڈال دینا نہ عقل و منطق کی رُو سے جائز ہے' نہ اسلام کی رُو سے۔ یہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے' اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحیح بات بھی اربابِ اقتدار کو اپیل نہیں کرتی۔ جن کی ذہنیت یہ بن جاتی ہے وہ خیرخواہی کے جذبے سے بالکل خالی ہو جاتے ہیں' درآں حالیکہ یہ جذبہ دعوتِ دین کی اصل روح ہے۔ اگر انسان خیرخواہی کے جذبے سے خالی ہو تو اُس کی ہر بات نفرت اور عناد کی تخم ریزی کرتی ہے اور اگر وہ اس کے ساتھ دین کا نام لیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین کو بھی لوگوں کی نگاہوں میں ایک نفرت انگیز چیز بنانا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں دین کو جو نقصان پہنچا ہے' وہ دین کے کھلے ہوئے دشمنوں کے ہاتھوں بھی نہیں پہنچا ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی ایک نفسیاتی جنگ میں دین کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال

کرتے ہیں اور اس طرح بلاوجہ دین کو ان تمام لوگوں کے سامنے ایک حریف بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں جن سے ان کی لڑائی ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس طرح کے لوگ انسانیت اور خلق کی محبت سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دل سے اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ ملک میں زلزلے آئیں، قحط پڑیں، سیلاب آئیں، وبائیں پھیلیں تاکہ یہ ان سب چیزوں کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرا کر اپنے اقتدار کے لیے راہ ہموار کریں۔ ایسے بے درد اور سنگ دل لوگوں سے یہ توقع رکھنا کہ یہ دین کی کوئی خدمت انجام دے سکیں گے، محض خام خیالی ہے۔

آپ نے جو قرارداد پاس کی ہے اُس میں آپ نے ان تمام طریقوں سے الگ اپنے لیے ''الدّین النّصیحة'' کی راہ اختیار کی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کی خیر وشر سے بے نیاز نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ یہ خیر خواہی کے خلاف ہے۔ اسی طرح آپ کسی کے شر کو خیر بھی نہیں کہہ سکتے، اس لیے کہ یہ بھی حق اور خیر خواہی کے خلاف ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس آپ کسی کی مخالفت کے جوش میں اس کی نیکی کو بدی نہیں ٹھہرا سکتے، اس لیے کہ یہ بھی سچائی اور خیر خواہی کے خلاف ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ دین کو ہوسِ اقتدار کی جنگ میں ایک ہتھیار کے طور پر کبھی استعمال نہیں کریں گے بلکہ جس کے سامنے بھی اس کو پیش کریں گے، اللہ کے دین کی حیثیت سے پیش کریں گے، کہ اسی میں اُس کی بھی بھلائی ہے اور اسی میں آپ کی بھی بھلائی ہے۔ یہی حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریق کار ہے اور یہی آپ کو اختیار کرنا ہے۔

رفیقو! میں سمجھتا ہوں کہ ایک واضح چیز کی وضاحت کرنے میں آپ کا بہت سا وقت میں نے لیا۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور اپنے لیے اور آپ کے لیے دعا کرتا ہوں کہ ہم نے جو کچھ طے کیا ہے، اس پر ہم عمل کرنے کی توفیق پائیں۔

اَقُوْلُ قَوْلِی هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ!

تقریر مولانا عبدالغفار حسن

حمد وثنا کے بعد

رفقائے محترم!

صبح کے درسِ قرآن، پھر قرارداد اور اس کی توضیح اور سب سے بڑھ کر مولانا اصلاحی کی تقریر سے معاملے کے اکثر پہلو اچھی طرح واضح ہو چکے ہیں اور اب میری تقریر کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی، تاہم جو خدمت میرے سپرد ہے میں اس کی انجام دہی میں بعض باتیں آپ حضرات کے سامنے رکھتا ہوں۔ تکرار سے بھی کم از کم تذکیر کا فائدہ تو حاصل ہو ہی جائے گا۔

ایک نئی دینی جماعت کے قیام کے فیصلے پر سب سے پہلے جو سوال ذہنوں میں پیدا ہونا لازمی ہے وہ یہ ہے کہ آخر ایک نئی جماعت کی ضرورت کیا ہے! اوّلاً کیا انفرادی طور پر کام کرنا کافی نہیں ہے؟ ثانیاً اگر اجتماعیت لازمی ہے تو بھی ڈیڑھ اینٹ کی ایک نئی مسجد الگ بنانے کی کیا حاجت ہے؟ بہت سی دینی تنظیمیں اور جماعتیں موجود ہیں، کیوں نہ ان میں سے کسی کے ساتھ شامل ہو کر کام کیا جائے؟

جہاں تک اجتماعیت کی ضرورت و اہمیت کا تعلق ہے، اس پر مولانا اصلاحی بہت مفصل روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہ بدیہی بات ہے کہ بہت سے لوگوں کے علیحدہ علیحدہ کام کرنے اور ان سب کے مل کر اجتماعی طور پر کام کرنے میں نتائج کے اعتبار سے زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اجتماعیت میں ہر فرد ایک دوسرے کا سہارا اور ایک دوسرے کی کمی پورا کرنے والا ہوتا ہے، جس سے کام میں عظیم برکت پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ نے مختلف لوگوں کو مختلف صلاحیتیں دی ہیں۔ کسی کو بولنے کی صلاحیت دی ہے، کسی کو لکھنے کی، کسی کو بھاگ دوڑ کی قوت دی ہے، کسی کو غور و فکر اور تدبر و تفکر کی۔ اسی طرح کسی کو علومِ دینی سے سرفراز فرمایا ہے اور کسی کو معلوماتِ دنیوی سے بہرہ ور فرمایا ہے۔ کسی کو فہم قرآن کے بحرِ عمیق میں غوطے لگانے کی صلاحیت دی ہے تو کسی کو علومِ حدیث کی وسعتوں میں پیراکی کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ کسی کو قدیم کی واقفیت عطا فرمائی ہے تو کسی کو جدید سے رُوشناس کیا ہے۔

مختلف صلاحیتوں اور قوتوں سے مسلح افراد کے مجتمع اور متحد ہو کر کام کرنے سے ہی اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ کوئی جامع اور ہمہ گیر نوعیت کا کام سرانجام پا سکے۔ پھر دین و

مذہب کے مخالف اورلادینیت کے علمبرداروں کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح منظّم ہوکر کام کررہے ہیں اوران کے مختلف گروہ اور جتھے مختلف اطراف سے پوری تنظیم اوراجتماعیت کے ساتھ دینی قوتوں پر یلغار کررہے ہیں۔اب ظاہر ہے کہ اجتماعیت کا مقابلہ انفرادیت سے نہیں کیا جاسکتا' اس کے لیے اجتماعیت ہی کی ضرورت ہے۔ بنابریں دینی قوتوں کا منظّم ومجتمع ہونا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

بلاشبہ جماعت سازی سے کچھ اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں۔مثلاً ایک یہ کہ اس سے جماعتی وگروہی عصبیت' پھر تعصب اور بالآخر تحـزّب و تفـرّق کی لعنت وجود میں آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جماعتیں بالعموم شخصیتوں کے گرد گھومتی ہیں اوران سے شخصیت پرستی کی مہلک بیماری پیدا ہوتی ہے۔تیسرے یہ کہ خود جماعتیں عموماً داخلی انتشار کا شکار ہوجاتی ہیں اور بعض اوقات اس سے انتہائی کریہہ صورتِ حال پیدا ہوجاتی ہے۔

اس سلسلے میں اوّلین بات تو یہ ہے کہ ہر چیز کے مجموعی فائدے یا نقصان کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ بہت سے اچھے کاموں میں کوئی پہلو بُرائی کا ہوسکتا ہے اور بہت سی برائیوں میں کوئی پہلو اچھائی کا ہونا ممکن ہے۔قرآن مجید نے خود شراب اور جوئے کے بارے میں بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ ان میں منفعت بھی ممکن ہے لیکن ﴿وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ ''ان کا شر ان کی منفعت سے زیادہ ہے''۔اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز میں خیر کا پہلو غالب ہو اس کو اختیار کرنا چاہیے اوراس کے شر سے بچاؤ کی ہر ممکن تدبیر کرنی چاہیے۔

''شخصیت پرستی'' کی لعنت کے پیدا ہونے کے امکانات وہاں زیادہ ہوتے ہیں جہاں کسی ایک داعی کی دعوت پر لوگ جمع ہوں اوراسی کے خیالات ونظریات وتصورات اوراسی کے فہم وفکر کو اس اجتماعیت میں مرکز ومحور کی حیثیت حاصل ہوجائے۔اس کے برعکس اگر ابتدا سے بہت سے لوگ باہمی مشاورت سے اپنے مقصد اوراس کے حصول کے طریق کو طے کریں اور مسلسل ''اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'' کی قرآنی ہدایت پر عمل پیرا رہیں تو ان شاءاللہ اس لعنت کا سدباب ہوجائے گا۔

''تـحـزّب اورتفرق'' سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دین کی خدمت کے لیے جمع ہونے والے لوگ ہمیشہ ''اِنَّنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ'' ہی کو اپنا واقعی شعار بنائیں اوراپنے آپ کو اُمت مسلمہ ہی کا ایک حصہ تصور کریں۔ چنانچہ نہ ان میں کوئی غرور و گھمنڈ پیدا ہو نہ اپنے

''چیزے دگر'' ہونے کا احساس پیدا ہونے پائے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے کسی اعتبار سے بہتر و برتر تصور کریں۔

یہاں یہ حقیقت بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ تحزّب اور تفرق محض جماعت سازی ہی سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ کوئی ادارہ یا محض درس گاہ یا دارالعلوم بھی ان کا سبب بن سکتا ہے' اور واقعہ یہ ہے کہ بنا ہے' اور اس کی مثالیں خود ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو درس گاہ نئی قائم ہوتی ہے وہ بالعموم کسی ایک خصوصیت کی حامل ہوتی ہے۔ نتیجتاً اس سے فارغ ہونے والے نوجوانوں کا مزاج ایک خاص رنگ میں ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے اور مرورِ ایام کے ساتھ اس کے فارغین و متوسلین میں گروہی و حزبی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب نہ تو یہ صحیح ہے کہ ان خدشات کی بنا پر درس گاہیں اور دارالعلوم قائم کرنے بند کر دیئے جائیں اور نہ یہ صحیح ہے کہ دینی مقاصد کے حصول کے لیے ادارے یا جماعتیں قائم کرنا ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اس کے برعکس دارالعلوموں اور اداروں کے قیام کے ساتھ حتی الامکان ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں کہ ان کے ذریعے اُمت میں تفرقہ و انتشار پیدا نہ ہو۔ اس سلسلے میں جس قدر میں نے غور کیا ہے' میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک تو جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے لوگوں میں کچھ ''چیزے دگر'' ہونے کے احساس کو پیدا ہونے سے روکا جائے اور ''اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ'' کی قرآنی ہدایت کو ہمیشہ مستحضر رکھا جائے اور دوسرے یہ احتیاط کی جائے کہ عملاً جمعہ و جماعت اور ربط و ضبط اور رشتوں ناطوں کے معاملات کو صرف ہم خیال لوگوں کے حلقے میں محدود کرنے کا رجحان نہ پیدا ہو ___ ان تدابیر پر اگر عمل کیا جائے تو میری رائے میں کوئی دینی جماعت فرقے میں تبدیل نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم!

تیسرا اندیشہ جماعتوں کے ''داخلی انتشار'' کا ہے تو اگرچہ ماضی کے کچھ تلخ تجربات کی روشنی میں واقعتاً اس اندیشے سے طبیعت میں بہت زیادہ توحّش پیدا ہوتا ہے تاہم یہ حقیقت بادنیٰ تامل سامنے آ جاتی ہے کہ محض اس اندیشے کی بنا پر اجتماعی جدوجہد سے باز رہنا ہرگز ایک معقول بات نہیں ہے۔ اختلاف اس عالمِ واقعہ کی ایک عظیم (اگرچہ تلخ) حقیقت ہے ___ لَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ تحریکیں اُٹھتی ہیں اور بہت کچھ مفید کام کرتی ہیں' پھر ان میں داخلی انتشار رونما ہو جاتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ آپ اپنے خنجر سے خودکشی کر لیتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ ان کا کام نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے۔ ان کے اثرات

ان کے بہت بعد تک بھی باقی رہتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ کام شروع کیا جائے۔ اختلافات کے حل کے لیے صحت مند راستے حتی الامکان کھلے رکھے جائیں۔ اس کے بعد بھی کبھی ناگوار صورتِ حال پیدا ہو تو اس کا سامنا کیا جائے۔

اب دوسرے سوال کو لیجیے —— یعنی یہ کہ آخر ایک نئی جماعت کا قیام ہی کیوں ضروری ہے؟ کیوں نہ موجود الوقت دینی جماعتوں میں سے کسی کے ساتھ مل کر کام کیا جائے؟

اس سوال کا سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ جس طرح ملک میں بہت سی درس گاہوں اور دارالعلوموں کے وجود سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی نئی درس گاہ قائم نہ کی جائے اسی طرح بہت سی دینی جماعتوں کا وجود کسی نئی جماعت کے قیام کی نفی نہیں کرتا اور جس طرح ایک نئے دارالعلوم کے مؤسسین کے بارے میں لازماً یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ان کی رائے بقیہ درس گاہوں کے بارے میں بہت بُری ہے' اس طرح ایک نئی دینی جماعت کے مؤسسین کے بارے میں یہ سمجھنا کہ یہ لازماً دوسری دینی جماعتوں کے بارے میں بہت بُری یا حقارت آمیز رائے رکھتے ہیں' درست نہیں ہے۔

مزید وضاحت کے لیے عرض ہے کہ اس وقت جو جماعتیں ملک میں بالفعل موجود ہیں' ہمارے نقطہ نظر سے ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن سے ہمیں کلی اختلاف ہے' یعنی ان کے طریق کار اور ان کے مزاج اور ذہن کو ہم درست نہیں سمجھتے۔ ایسی جماعتوں میں مدغم ہونے یا ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری جماعتیں ایسی ہیں جو ہماری رائے میں بعض کام بہت اچھے سرانجام دے رہی ہیں لیکن ان کے کاموں میں کچھ خلا ہے اور دین کے دوسرے بعض تقاضے اس کے ذریعے پورے نہیں ہو رہے ہیں۔ ایسی جماعتوں کے ساتھ دو طرح کا معاملہ نظری اعتبار سے ممکن ہے۔ ایک یہ کہ ان کے ساتھ شامل ہو کر کام کیا جائے اور ان کے اندر رہ کر زور ڈالا جائے کہ دین کے دوسرے تقاضوں کو بھی پورا کیا جائے۔ یہ طریق بظاہر بڑا معقول اور مستحسن نظر آتا ہے لیکن عملاً اپنے اندر بہت سی پیچیدگیاں رکھتا ہے۔ ہر جماعت کے مؤسسین کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اور ان کے ذہن کی ایک خاص ساخت ہوتی ہے جسے بآسانی بدلا نہیں جا سکتا' اور اگر بدلنے کی کوشش کی جائے تو اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا کہ خواہ مخواہ کی کھینچ تان اور بدمزگی پیدا ہو اور ہاتھ کچھ نہ آئے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر ان کے نزدیک کوئی دوسرا پہلو اہم تر ہے تو وہ آپ کی وجہ سے کسی

اور پہلو پر کیوں زیادہ زور دیں۔ لہٰذا عملاً دوسرا طریق ہی ممکن العمل بھی ہے اور بہتر بھی یعنی یہ کہ دوسرے لوگ ایک علیحدہ اجتماعیت قائم کریں اور اپنے ذہن وفکر اور اپنی صوابدید کے مطابق کام کریں۔ اب اگر خلوص اور للّٰہیت موجود ہے تو یہ دونوں کام ایک دوسرے کے معاون اور ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرنے والے بن جائیں گے اور اگر اخلاص کی دولت ہی سے تہی دامنی ہو تو پھر بھی زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ جیسا تصادم اندر تھا ویسا ہی باہر بھی ہوگا۔ اس صورت میں بھی علیحدہ جماعت سازی پہلی صورت کے مقابلے میں زیادہ نقصان دہ تو کسی طرح نہیں ہوسکتی!

اب میں آپ کے سامنے اس نئی دینی تنظیم کے کچھ خصائص پیش کروں گا' جس کے قیام کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ان کا تذکرہ قرارداد میں بھی ہے اور ان کی توضیحات میں بھی۔ پھر مولانا اصلاحی بھی اپنی تقریر میں ان میں سے بعض کی وضاحت کر چکے ہیں۔ میں ان کو سلسلہ وار پیش کرتا ہوں تاکہ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا' کم از کم تذکیر ہو جائے۔

پہلی خصوصیت ہماری پیش نظر تنظیم کی یہ ہے کہ اس میں نصب العین کے مقام پر صرف نجات اور رضائے الٰہی کے حصول کو رکھا گیا ہے اور اس میں ایسی کوئی تفریق نہیں رکھی گئی کہ دنیا میں ہمارا مقصود یہ ہے اور آخرت میں یہ! دنیا دارالعمل ہے اور آخرت دارِ جزا۔ دنیا میں انسان دین وشریعت کے جملہ تقاضوں کو اُخروی جزا ہی کے لیے پورا کرتا ہے۔ لہٰذا ہر آن اور ہر لمحہ ہمارا نصب العین ایک ہی ہے اور وہ ہے آخرت کی کامیابی!! اس کے لیے دین کے جملہ انفرادی واجتماعی تقاضوں کو اسی ترتیب وتدریج اور تقدیم وتاخیر کے ساتھ پورا کرنا ضروری ہے جو خود نظامِ دین میں متعین ہے! ان میں سے کسی ایک تقاضے کو اہمیت دے کر ''نصب العین'' کے مقام پر لے آنا ہرگز صحیح نہیں!

دوسری خصوصیت ہماری اس تنظیم کی یہ ہوگی کہ ہماری دعوت صرف اللہ اور اس کے دین کی طرف ہوگی' نہ کسی خاص شخصیت یا جماعت کی طرف ہوگی' نہ کسی خاص مسلک یا فقہی مذہب کی طرف!

اسی بنا پر اس اجتماعیت کی تیسری خصوصیت یہ ہوگی کہ یہ نہ کسی فرد یا گروہ کی حلیف ہوگی نہ حریف۔ اس میں حب اور بغض اور محبت ونفرت کا معیار صرف اللہ اور اس کا دین ہوں گے۔ یہ ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاۤءَ لِلّٰهِ﴾ کے قرآنی حکم پر عمل پیرا ہونے کی مقدور بھر سعی

کرے گی اور حتی الامکان کوشش کرے گی کہ ذاتی یا گروہی عصبیت یا تعصب کی بنا پر عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ ﴿لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ﴾ چنانچہ ہمارے لیے کسی حزبِ اختلاف کا تصور خارج از بحث ہوگا۔ مغربی جمہوریت کے پیدا کردہ ان تصورات سے عدل وانصاف کے تقاضے پامال ہو جاتے ہیں اور انسان اپنی جماعت کے بُرے سے بُرے کام کی حمایت اور حزبِ مخالف کے اچھے سے اچھے کام کی مخالفت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پیش نظر اسلامی تنظیم ان شاء اللہ ﴿تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ کے قرآنی احکامات پر عمل پیرا ہوگی۔

چوتھی خصوصیت ہماری اس اسلامی تنظیم کی یہ ہوگی کہ یہ طبقاتی تصور اور اس سے پیدا شدہ تنازع للبقا کے بجائے وحدتِ الٰہ و آدم اور توافق یا تعاون للبقا کے تصور کو اُجاگر کرنے کی کوشش کرے گی۔

پانچویں خصوصیت دینی مسائل اور ان سے متعلق اختلاف مذاہب ومسالک کے متعلق ہے۔ ہمارے نزدیک جملہ دینی مسائل تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو اساسی اور بنیادی بھی ہیں اور متفق علیہ بھی۔ دوسرے وہ جو متفق علیہ تو ہیں لیکن اساسی نہیں ہیں۔ تیسرے وہ مسائل ہیں جن میں سلف اور خیر القرون ہی سے اختلاف چلا آ رہا ہے۔ ہماری یہ تنظیم ان شاء اللہ اپنی اصل توجہ کا مرکز ومحور پہلی قسم کے مسائل ہی کو بنائے گی۔ اس لیے بھی کہ فی الواقع وہی اساسی اور بنیادی ہیں اور اس لیے بھی کہ موجودہ دَور کے فتنوں کی زد دراصل ان ہی پر پڑ رہی ہے' یعنی ایمان باللہ' ایمان بالرسالت' اور ایمان بالآخرت ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں لہٰذا اس وقت اصل ضرورت ان کے استحکام کی ہے' اور ان کے معاملے میں کسی قسم کی رواداری اور مداہنت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ دعوت میں نرمی اور حکمتِ تبلیغ بالکل دوسری چیز ہے اور مداہنت فی الدین بالکل دوسری' ان معاملات میں مصلحت کی بنا پر رواداری ممکن نہیں ہے —— البتہ تیسری قسم کے مسائل میں تشدد اور غلو کسی طرح جائز نہیں ہے۔ ان میں بھی مذاکرہ اور باہمی تبادلہ خیال ہوسکتا ہے لیکن کسی ایک رائے یا مسلک کو بالجبر دوسروں پر ٹھونسنا کسی صورت میں درست نہیں۔ ہم اپنی اجتماعیت میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جس میں ان اختلافی مسائل کے بارے میں انتہائی رواداری اور فراخ دلی پائی جائے۔

چھٹی خصوصیت جو قرارداد میں صراحت کے ساتھ مذکور ہو چکی ہے' یہ ہے کہ اس میں

''اَلْاَھَمُّ فَالْاَھَمُّ'' کا اصول پیش نظر رکھا جائے گا اور تبلیغ ودعوت میں تدریج ملحوظ رہے گی۔ یہ تمام معاملات احادیثِ نبوی ﷺ میں بصراحت مذکور ہیں۔

ساتویں خصوصیت اس اجتماعیت کی جیسا کہ قرارداد سے واضح ہے' یہ ہوگی کہ اس کا دائرۂ کار صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ غیر مسلم بھی اس کے مخاطب ہوں گے۔ مسلمانوں کی خامیوں کی اصلاح بھی ہمارے فرائضِ دینی میں شامل ہے اور غیر مسلموں تک اسلام کی تبلیغ اور ان پر رسالتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جانب سے اتمامِ حجت بھی ہماری دینی ذمہ داریوں میں سے ہے۔ ہماری یہ اسلامی تنظیم ان شاء اللہ اس ضمن میں بھی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کوشاں ہوگی۔

پیش نظر تنظیم کی متذکرہ بالا خصوصیات تو وہ ہیں جو ہمارے مابین متفق علیہ ہیں اور ہماری قرارداد میں صراحتاً یا دلالتاً مذکور ہیں۔ اب میں بعض ایسی خصوصیات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو میری ذاتی رائے میں ہمیں اختیار کرنی چاہئیں۔ ان میں اختلاف کی گنجائش تو ہے لیکن مجھے امید ہے کہ ان میں سے اکثر کو آپ حضرات اپنے دل ہی کی آواز محسوس کریں گے۔

ان میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ہمیں اذکار واوراد کے معاملے میں یہ اُصول متعین کر لینا چاہیے کہ ہم اَوراد و وظائف اوراذکار وادعیہ میں سے صرف ان کو اختیار کریں جو اللہ کی کتاب یا رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ماخوذ ہوں۔ ان کا اولین فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہم خدا اور رسول ﷺ کے ساتھ جڑے رہیں گے اور اس سے یقیناً ایک عظیم روحانی فائدہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی اس سے افتراق وانتشار میں بھی کمی ہوگی۔ مختلف لوگ اپنے ذوق کے اعتبار سے مختلف اذکار اختیار کر لیں تو رفتہ رفتہ یہی ان کی مابہ الامتیاز خصوصیت بن جاتے ہیں اور اس سے ایک علیحدگی کا احساس پیدا ہوسکتا ہے' لہٰذا اس اعتبار سے بھی عافیت اسی میں ہے کہ صرف مسنون اور ماثور ادعیہ واذکار پر اکتفا کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ مثبت اور منفی دونوں کام سامنے رکھے جائیں۔ دین میں معروف کے امر کے ساتھ منکر کی نہی کا بھی حکم دیا گیا ہے اور احقاقِ حق کے ساتھ ابطالِ باطل کو بھی لازم ٹھہرایا گیا ہے۔ آج کل جو عام خیال پھیل گیا ہے کہ صرف مثبت کام کرنا چاہیے' منفی کام نہیں کرنا چاہیے تو یہ میری ذاتی رائے میں ازرُوئے دین درست نہیں ہے۔ دعوت کا اچھے سے اچھا اسلوب اختیار کرنا اور حکمتِ تبلیغ کو پیش نظر رکھنا بالکل دوسری بات ہے اور انکارِ منکر اور ابطالِ باطل سے قطعاً صرفِ نظر کر کے صرف ''مثبت'' باتوں کو پیش کرتے رہنا بالکل دوسری چیز ہے۔ دینی

غیرت وحمیت کا لازمی تقاضا میرے نزدیک یہ ہے کہ خلافِ دین وشرع امور پر برملا تنقید کی جائے‘ چاہے اس کا ہدف اصحابِ اقتدار بنتے ہوں چاہے عوام۔ اس معاملے میں یہ پہلو بھی لائق توجہ ہے کہ آج کل حکومت کی خلافِ مذہب باتوں پر تنقید کرنے والے تو پھر بھی مل جاتے ہیں‘ عوام کو ان کی خلافِ دین باتوں پر ٹوکنے والا کوئی نہیں رہا‘ جبکہ میری ذاتی رائے میں آج کے زمانے میں عوام کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کبھی سلاطین واُمراء کو حاصل تھی اور اس اعتبار سے ان کی نظری وعملی گمراہیوں اور ضلالتوں پر تنقید بھی ’’**افضل الجھاد**‘‘ کے حکم میں داخل ہوگئی ہے۔

تیسرے یہ کہ جاہلیتِ قدیمہ اور جاہلیتِ جدیدہ دونوں کا ابطال کیا جائے۔ یہ تو ہوسکتا ہے بلکہ غالباً یہی ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ جاہلیتِ قدیمہ کی بیخ کنی کی صلاحیت وقدرت سے مسلح ہوں اور کچھ دوسرے لوگ جاہلیت جدیدہ کے استیصال کی قدرت وطاقت رکھیں۔ چنانچہ انہیں اپنے اپنے محاذوں پر کام کرنا ہوگا‘ لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں محاذ پیش نظر رہیں اور کسی سے صرفِ نظر نہ ہونے پائے۔

چوتھی کوشش پیش نظر تنظیم اسلامی میں اس امر کی ہونی چاہیے کہ نہ تو نری عقلیت پر انحصار کیا جائے اور نہ ہی نری جذباتیت پر دارومدار ہو بلکہ عقل اور جذبے دونوں کو مناسب مقام پر رکھ کر کام کیا جائے۔ جو بات کہی جائے وہ صرف عقلی ہی نہ ہو بلکہ دِل سے بھی نکلے تاکہ اس کے مخاطب اہل عقل بھی ہوں اور صاحبانِ دل بھی۔ اور دعوت خود اہلِ عقل کے بھی دل میں گھر کر جائے!

پانچویں لازمی چیز جس کا پورا اہتمام ہماری اس تنظیم میں کیا جانا چاہیے یہ ہے کہ اس میں تنقید پر کوئی پہرا نہ لگایا جائے اور ایسی کوئی پابندی نہ لگائی جائے جس سے لوگوں کی زبانیں بند ہوجائیں۔ تنقید کے صحیح اسلامی آداب کی پابندی تو یقیناً لازم ہے لیکن تنقید کے دروازوں کو بند کردینا پیش نظر تنظیم کی پیشگی ہلاکت کا سامان ہوگا۔ اس تنظیم کے اربابِ حل وعقد کا تنقید کو برداشت کرنے کی ہمت وصلاحیت سے مسلح ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہے کہ پیش نظر تنظیم کا نظام شورائی ہو اور قرآن حکیم کی اس ہدایت کہ: ’’**وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَيْنَهُمْ**‘‘ کا جیتا جاگتا نمونہ ہو۔

چھٹی خصوصیت ہماری اجتماعیت کی یہ ہونی چاہیے کہ اس میں زہد خشک اور تفریح بے قید کے مابین درمیانی کیفیت پیدا ہو اور نہ تو ’’**عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا**‘‘ کا نقشہ پیدا ہوجائے‘ نہ دوسری

انتہا ہو کہ ہر وقت ہنسی دل لگی اور تفریح کا ماحول طاری رہے۔ اسی طرح ''رہبانیت'' اور ''تنعُّم'' کے مابین درمیانی کیفیت کا پیدا کرنا بھی لازمی ہے۔ دین میں نہ قطعی ترک لذائذ کی ترغیب ہے اور نہ عیش پرستی کی گنجائش ہے۔ اللہ کی نعمتوں سے جائز طریقے سے متمتع ہونے کو برا سمجھنا بھی دین کی رُوح کے منافی ہے اور عیش کوشی بھی از روئے دین ممنوع ہے۔

ساتویں ضروری چیز جو قرارداد کی توضیح میں بہت وضاحت کے ساتھ آ چکی یہ ہے کہ انتظامی اور تنظیمی امور میں دلچسپی کے ساتھ اسی درجہ کا گہرا شغف تعبدی امور میں ہونا لازمی ہے ورنہ بالکل یک رُخی شخصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کی بدولت دینی تنظیموں میں بہت سی خرابیاں رُونما ہو جاتی ہیں۔ پیش نظر تنظیم میں اِن شاءاللہ اس امر کی خصوصی نگہداشت کی جائے گی۔

آٹھویں اور آخری ضروری چیز یہ ہے کہ اپنے زمانے کے مخصوص فتنوں کا صحیح فہم اور ان کی اہمیت کا صحیح شعور حاصل کیا جائے۔ اس معاملے میں دین کے خادموں کو بالکل ماہر تشخیص طبیب کے مانند ہونا چاہیے تا کہ وہ اپنے زمانے کی اصل اور بنیادی بیماریوں کی صحیح صحیح تشخیص کر سکیں۔ بصورت دیگر یہ ہوسکتا ہے اور بسا اوقات ہوتا ہے کہ ساری جدوجہد علامات کے خلاف ہوتی رہتی ہے اور بیماری کی اصل جڑ جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی نگاہِ حقیقت بین نے بالکل صحیح اندازہ کرلیا تھا کہ منع زکوٰۃ وغیرہ جیسے بظاہر ''فروعی'' معاملات کی تہہ میں اصل مرض کون سا کام کر رہا ہے۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی نگاہِ دُوررس نے بھی اپنے وقت کے فتنے کا صحیح اندازہ کرلیا تھا۔ پھر ان کے بعد بھی تمام مجددین اپنے اپنے دَور کے فتنوں کی اہمیت کا اندازہ کر کے ان کے سدّ باب کی سعی کرتے رہے' **فَجَزَاهُمُ اللّٰه خير الجزاءِ عن جميع المسلمين** ۔ اپنے وقت کے امراض کی صحیح تشخیص کے لیے بڑی گہری بصیرت کی ضرورت ہے اور یہ چیز درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف ہی سے ہوتی ہے۔ تاہم اپنے مقدور بھر اس امر کی سعی ضروری ہے کہ کسی ایک ہی پٹی ہوئی راہ پر چلتے رہنے کے بجائے اس پر مسلسل غور وفکر اور تفکر وتدبر کیا جاتا رہے کہ ہمارے زمانے کے اصل فتنے کون سے ہیں اور ان کے سدّ باب کی صحیح راہ کون سی ہے۔

آخر میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر کے اپنی معروضات کو ختم کرتا ہوں کہ جو کام کرنے کا عزم ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے کیا ہے وہ بیک وقت آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس اعتبار سے کہ یہ ہمارے دین کا تقاضا' ہماری فطرت کی پکار اور سب سے بڑھ

کر یہ کہ ہمارے پروردگار کی جانب سے عائد کردہ فرض ہے۔ لہٰذا اس کی ادائیگی کی سعی و جہد سے دلوں کو راحت اور قلوب کو اطمینان وسکون حاصل ہوگا —— اور مشکل اس اعتبار سے کہ بسا اوقات اس راہ کی مسلسل جدوجہد کا کوئی محسوس نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہیں آتا اور انسان کو کمال صبر واستقامت کے ساتھ اپنی محنت کے نتائج وثمرات سے بالکل بے نیاز ہو کر کام کیے جانا پڑتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ ''اے علی! اگر اللہ تیرے ذریعے کسی ایک انسان کو بھی ہدایت کی راہ پر لے آئے تو یہ تیرے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے''! بس یہی اس راہ کے ہر مسافر کا ماٹو (Motto) ہونا چاہیے اور اگر اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ ایک فردِ بشر کو بھی سیدھی راہ پر لے آئے تو اسے چاہیے کہ اس بات کو واقعتاً ایک دولتِ بے بہا اور نعمتِ غیر مترقبہ تصور کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ہمارے قلب ونظر کی کیفیت فی الواقع یہ نہ ہو جائے تو اس راہ میں ثابت قدم رہنا محال ہے۔

آخر میں مَیں اپنے اور آپ سب کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہدایت واستقامت اور عفو و مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ○

مولانا اصلاحی کا الوداعی خطاب

عزیز ساتھیو!

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ نے ایک جماعتی نظم کے قیام کی قرارداد پر اتفاق کر لیا۔ میں اس پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے لیے عزم و ہمت عطا فرمائے، اور ہر قدم پر ہماری دست گیری اور رہنمائی فرمائے —— میں اس موقع پر آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہر چند اس کی ضرورت اور اہمیت مجھ پر واضح تھی، لیکن میں دو سبب سے اس قسم کی ذمہ داری سے گریز کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ اب میرے قویٰ ضعیف ہو رہے ہیں، کوئی بھاری بوجھ اُٹھانا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ دوسرا یہ کہ زندگی کے اِس آخری دور کے لیے اپنے ذوق کے مناسب جو کام میں نے تجویز کر لیا تھا، اب وقت و فرصت کا لمحہ لمحہ اس پر صرف کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دوستوں کے شدید اصرار بلکہ دباؤ کے باوجود میں خود اس کے لیے پہل کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ دوستوں نے جب کبھی اس فریضہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی، میں ان کے دلائل کا تو انکار نہ کر سکا لیکن اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر نگاہ کر کے اُن کی بات کو ٹالتا ہی رہا۔ میں یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اگرچہ میرے اوقات تمام تر دینی و علمی کاموں ہی میں بسر ہو رہے ہیں، تاہم معاشرے سے متعلق مجھ پر جو فریضہ عائد ہوتا ہے اُس میں مجھ سے کوتاہی ہو رہی ہے، جس کے سبب نہ صرف میری بعض صلاحیتیں سکڑ رہی ہیں، بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس پر مجھ سے مواخذہ ہو۔ ان تمام احساسات کے باوجود میں اپنے آپ کو معذور سمجھتا رہا، جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معذور سمجھنے میں بڑا فیاض ہوتا ہے۔

بہرحال اب میں پورے شرحِ صدر کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتا ہوں اور اُن تمام دوستوں کا دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے اس عظیم فرض کی اہمیت کو سمجھا اور ہم سب کو اس کے سمجھانے کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

میرے ذمہ اس وقت آپ تمام شرکائے مجلس کو بعض ضروری ہدایات دینے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ یہ ہدایات ان کاموں سے متعلق ہیں جو آپ کو یہاں سے رخصت ہونے کے بعد کرنے ہیں۔ براہ کرم اِن کو نوٹ کر لیجیے۔

جماعتی تنظیم سے متعلق اس وقت آپ کو پہلا کام یہ کرنا ہے کہ تنظیم کے نظام و دستور سے

متعلق آپ کے سامنے جو تجویزیں ہیں وہ مقامی رفقاء سے مشورہ کے بعد قلم بند کر کے شیخ سلطان احمد صاحب کے پاس بھیج دیجیے تاکہ مجلسِ مشاورت اُن سے فائدہ اٹھا سکے۔ حتی الوسع اس بات کی کوشش کیجیے کہ تجاویز کے بارے میں اگر اختلاف رائے ہو تو وہ غور و بحث سے مقامی رفقاء ہی کے اندر طے ہو جائے' تاکہ آگے کا کام آسان ہو جائے۔ اگر غور و بحث کے بعد بھی کسی امر میں اختلاف باقی رہ جائے تو اس کو نوٹ کر دیا جائے۔

اپنی اور اپنے دوسرے بھائیوں کی اصلاح و تربیت سے متعلق جو کام آپ کو کرنے ہیں ان کے بارے میں مفصل ہدایات تو افرادی قوت کا جائزہ لینے کے بعد ہی دی جاسکیں گی لیکن چند کام ایسے ابتدائی اور بدیہی نوعیت کے ہیں کہ ان کا اہتمام بلا تاخیر آپ کو کرنا چاہیے۔

پہلا کام نماز کا اہتمام ہے۔ نماز ہمارے دین میں ایمان کا اوّلین تقاضا ہے۔ قرآن و حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ اسلامی تنظیم کی شیرازہ بندی اسی چیز سے ہوتی ہے' اور انبیاء علیہم السلام نے اصلاح و تربیت کا پہلا قدم اسی سے اٹھایا ہے۔ آپ بھی اس کی پابندی کے لیے مضبوط عہد کیجیے اور اپنے عزیزوں' قریبوں' دوستوں' پڑوسیوں اور محلّہ داروں کو بھی دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ اس کی تلقین کیجیے۔ نماز کے اہتمام میں یہ بات بھی داخل ہے کہ حتی الوسع محلّہ کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کیجیے۔ بغیر کسی معقول عذر کے اس میں کوتاہی نہ کیجیے اور دوسروں کو بھی نماز باجماعت کی عظمت و اہمیت سمجھانے کی کوشش کیجیے!!

دوسرا کام یہ ہے کہ اپنے دینی علم میں اضافہ کا اہتمام کیجیے۔ جن مقامات پر یہ ممکن ہو کہ کسی ذی علم کی رہنمائی میں قرآن مجید کا اجتماعی مطالعہ کیا جا سکے' وہاں حلقہ تدبرِ قرآن قائم کیجیے اور ہفتہ میں کم از کم ایک دن اس کام کے لیے خاص کیجیے کہ کچھ وقت قرآن کے فکر و مطالعہ میں بسر ہو۔ اس کے ساتھ اگر حدیث کی ایسی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا جائے جو اخلاقی احادیث پر مشتمل ہیں' مثلاً ریاض الصالحین وغیرہ' تو اس سے مزید خیر و برکت ہو گی۔ اگر کسی ذی علم کی رہنمائی حاصل نہ ہو تو عام حلقہ مطالعۂ اسلامی قائم کیجیے اور منتخب اسلامی کتب کا التزام سے مطالعہ کیجیے۔ اس قسم کے حلقوں میں اپنے اُن دینی بھائیوں کو بھی شرکت کی دعوت دیجیے جن کے اندر دین اور علم دین کی رغبت محسوس کریں۔

آپ لوگوں میں سے جن لوگوں نے جدید تعلیم پائی ہو' اُن کو میں یہ مشورہ بھی دُوں گا کہ وہ عربی زبان سیکھنے کی کوشش کریں' تاکہ وہ قرآن و حدیث سے براہ راست استفادہ کر سکیں۔

بظاہر یہ کام مشکل نظر آتا ہے لیکن شوق اور طلب سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اپنے اپنے شہروں میں جس عالم سے بھی اس کام میں آپ کو مدد ملنے کی توقع ہو‘ اس سے استفادہ کیجیے۔ ہم خود بھی حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس مسئلہ پر غور کریں گے کہ آسان طریقہ سے آپ کو عربی سکھانے کی کیا شکل اختیار کی جاسکتی ہے۔ لاہور میں اس سلسلے میں ہم نے جو تجربے کیے ہیں‘ ہم ان سے بھی آپ کو آگاہ کریں گے تاکہ جن مقامات پر اس نہج پر درس جاری ہو سکے وہاں اس نہج پر درس جاری کیے جائیں۔

تیسرا کام یہ ہے کہ اپنے اپنے مقامات پر اپنے ہم خیال اور رفیق تلاش کیجیے جن کے تعاون سے پیش نظر مقصد کو تقویت حاصل ہو۔ جو اس جدوجہد میں آپ کے لیے سہارا بن سکیں‘ جو آپ کی اصلاح کریں‘ اور جن کی آپ اصلاح کریں۔ جماعتی زندگی کی یہی خیر و برکت ہے جو انفرادی زندگی میں حاصل نہیں ہوسکتی۔ اگرچہ یہ زمانہ بہت بُرا ہے لیکن اِس بُرے زمانے میں بھی اچھی روحیں اور نیک نفوس موجود ہیں‘ ضرورت ٹٹولنے اور جستجو کی ہے۔ جب آپ جستجو کریں گے تو اللہ کے بے شمار بندے ایسے مل جائیں گے جو آپ کی رفاقت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ کتنے نفوس ہوتے ہیں جن کے اندر دینی حس موجود ہوتی ہے لیکن کوئی اُس کو اُکسانے والا نہیں ہوتا‘ اس وجہ سے وہ دبی ہوئی رہتی ہے۔ آپ ایسے نفوس تلاش کیجیے‘ اُن تک پہنچیے‘ اُن سے تبادلۂ خیالات کیجیے‘ اور اس کام میں اُن کو تعاون کی دعوت دیجیے۔ آپ کی اجتماعی طاقت جتنی ہی بڑھتی جائے گی اتنی ہی ان کاموں کی انجام دہی آپ کے لیے آسان ہوتی جائے گی جو افراد اور معاشرہ کی اصلاح سے متعلق آپ پیش نظر رکھتے ہیں۔

یہ چند ابتدائی کام ہیں جو اس قرارداد کی روشنی میں‘ جو آپ نے پاس کی ہے‘ فی الفور شروع کیے جاسکتے ہیں۔ آگے اللہ مزید کاموں کی راہیں کھولے گا‘ اگر ہمارے اندر اس کے دین کی خدمت کے لیے اخلاص ہوگا۔ اب دُعا کیجیے کہ ہمیں اس کام کے لیے سچا عزم حاصل ہو اور ہر قدم پر توفیق الٰہی ہماری رہنمائی فرمائے۔

تائید وتبصرہ

۱۔ مولانا عَبدُ الماجِد دَریابادی مرحوم

ایک نیا اصلاحی ادارہ

لاہور کے ایک معزز دینی ماہنامہ ''میثاق'' سے یہ معلوم کر کے دِلی خوشی ہوئی کہ وہاں چند ذی فہم وبصیرت مخلصوں کی سعی واہتمام سے ایک نئے دینی ادارہ کی بنیاد بالکل صحیح اُصول پر پڑ رہی ہے۔ یہ حضرات زیادہ تر جماعت اسلامی سے نکلے ہوئے ارکان ہیں اور یقین ہے کہ یہ ان شاءاللہ ان غلطیوں سے محفوظ رہیں گے، جن کا خوب تجربہ انہیں جماعت مذکور میں شامل رہ کر ہو چکا ہے۔ ادارہ کے ایک بانی مولانا امین احسن اصلاحی کی یہ بات آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے:

> ''جماعتیں اور تنظیمیں قائم تو ہوتی ہیں اصلاً کسی اعلیٰ و برتر نصب العین کے لیے لیکن قائم ہو جانے کے بعد وہ رفتہ رفتہ از خود نصب العین اور مقصد بن جاتی ہیں اور اصل نصب العین غائب ہو جاتا ہے!''

یہ ''صدق'' کے مسلک کی صد فی صد ترجمانی ہے۔ مولانا اصلاحی کی تقریر کا یہ ٹکڑا بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے:

> ''اربابِ اقتدار کی ہر بات کو ہدفِ تنقید بنا لینا، یہاں تک کہ اُن کے خیر کو بھی شر قرار دے لینا، اور اُس کی مخالفت میں اِس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی بُرائیاں بھی اُن کے کھاتے میں ڈال دینا نہ عقل و منطق کی رُو سے جائز ہے، اور نہ اسلام کی رُو سے۔ یہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے!''

اور پاکستان کی (ہندوستان کی نہیں) جماعت اسلامی کو شدید ترین نقصان شاید اسی چیز نے پہنچایا ہے۔ اللہ ہم کو پچھلی غلطیوں سے سبق لینے کی توفیق دے اور راہِ اصلاح و ہدایت پر مستقیم رکھے۔

خدمتِ دین کی گنجائشیں

''پاکستان کے دینی ماہنامہ 'میثاق' لاہور سے نئی دینی واجتماعی تنظیم کے سلسلے میں:

''آخر میں اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیشِ نظر تنظیم ہرگز ''الجماعت'' کے حکم میں داخل نہ ہوگی۔ ''الجماعت'' کا مقام ہماری دانست میں اُمتِ مسلمہ کو بحیثیت مجموعی حاصل ہے۔ دین کی خدمت ایک نہایت وسیع وعریض کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہی ہیں اور اِن شاء اللہ اُن کے ساتھ ہمارا رویہ تعاون وتائید ہی کا ہوگا!''

بات اصلاً بہت موٹی اور بالکل صاف وواضح ہے' لیکن اس زمانے میں بہت بڑی بات ہے۔ دین واُمت کی خدمت کے اتنے پہلو ہیں اور خدمت کے لیے گنجائش اتنی ہے کہ اگر نفسانیت کو چھوڑ کر تھوڑے سے بھی عزم وحوصلہ کے ساتھ خدمت کا ارادہ ہو تو خلوص اور فہمِ سلیم سے کام لینے والا ہر فردِ اُمت اس کے اندر کھپ سکتا ہے اور باہمی مناقشہ سے جواب تک بڑا اسنگِ راہ بنا ہوا ہے' نجات پا کر ہر گروہ اپنے مذاق واستعداد کے لحاظ سے سچا خادمِ دین بن سکتا ہے!''

(میثاق' لاہور: جنوری ۱۹۶۸ء بحوالہ ''صدقِ جدید' ۱۷ نومبر ۱۹۶۷ء)

۲۔ مولانا عبد البَاری ندوِی مرحوم

فرنگی ساخت کی جماعت سازی اور اُس کی فتنہ سامانی!

تازہ 'میثاق' میں زیادہ تر پرانی جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے حضرات جو ایک نئی جماعت بنا رہے ہیں اور جس کا ہمارے حضرت صاحبِ ''صدق'' نے بھی خیر مقدم کیا ہے' اس کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ آپ کی تقریر کی جس بات کی صاحبِ صدق نے داد دی ہے' میں بھی اُسے ہی سب سے زیادہ قابل داد اور آبِ زر کیا' آبِ جواہر سے لکھنے کے قابل پاتا ہوں۔ میں تو فرنگی ساخت کی جماعت سازیوں کے عین خمیر

ہی میں اس فساد کو داخل جانتا ہوں اور علی الاعلان کہا کرتا ہوں کہ یہ افتراق سازی کی بنیاد ہوتی ہے۔ انبیاء کا طریق یہ ہے کہ صاحبِ دعوت وعزیمت اپنی دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے اور بلا کسی مصنوعی جماعت سازی کے جو لوگ برضا و رغبت اِس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، بس وہی ''حزب اللہ'' بن جاتے ہیں اور قواعد وضوابط اور کثرتِ رائے وغیرہ کی بحث کے بغیر جب تک وہ داعی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں تبھی تک خیریت رہتی ہے۔ باقی جہاں اقلیت واکثریت وغیرہ کی رائے شماری اور صدر وسیکرٹری اور چندہ بازی وغیرہ کے جدید فرنگی طریقے داخل ہوئے، بس پھوٹ یقینی ہے کہ ایسی صورت میں جیسا آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے، (بالکل نفسیاتی طور پر) جماعت مقصود بن جاتی ہے اور اصل مقصود غائب ہوتے ہوتے بمنزلۂ صفر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جب تک غیر معمولی اخلاص وللّٰہیت کم وبیش تمام افرادِ جماعت میں نہ ہو، جماعتی عصبیت و رقابت اس جماعت سازی کا لازمہ ہے۔ مجھے تو ہمیشہ الٰہ آباد کے عارفِ اکبر کا یہ عارفانہ شعر برابر یاد آتا رہتا ہے، جس کے ذریعے اِس طرز کی جماعت سازیوں کے آغاز ہی میں انہوں نے آگاہ فرما دیا تھا:

کریما بہ بخشائے برحالِ بندہ
کہ ہستم اسیرِ کمیٹی و چندہ!

اور یہ سراپا ناکارہ......اور...... کے حضرات سے یہی عرض کرتا رہتا ہے کہ اپنی جماعتوں کو توڑ دیں کہ اُن میں سے انجام کسی ایک کا بھی بخیر نہ ہوا ...... میں جب آخر تک کوئی صدارت سے کنارہ کش ہونے سے راضی نہ ہوا تو بالآخر صدارت کو دو صدروں میں تقسیم کرنا پڑا!

(مولانا اصلاحی کے نام ایک خط سے ماخوذ)

☆☆☆

حصہ دوم

عقائد

یا

بنیادی دینی تصورات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تنظیم اسلامی کے بنیادی دینی تصورات —— یعنی عقائد —— اہل سنت والجماعت کے مطابق ہیں، جن کی رُو سے: ہر عاقل و بالغ مسلمان خواہ وہ مرد ہو یا عورت، پر لازم ہے کہ وہ:

(الف) پورے شعور وادراک کے ساتھ اقرار کرے کہ:

آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ، اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ

یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے اسماء وصفات سے ظاہر ہے اور قبول کرتا ہوں اس کے جملہ احکام، اقرار کرتا ہوں زبان سے اور تصدیق کرتا ہوں دل سے! —— اور

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ

یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر، اور اس کے فرشتوں پر، اور اس کی کتابوں پر، اور اس کے رسولوں پر، اور یوم آخر پر، اور تقدیر پر کہ اس کی بھلائی اور بُرائی سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد جی اُٹھنے پر۔

تشریح: اسلام کی اساس ایمان پر قائم ہے اور ایمان کی تعبیر کے لیے ایمان مجمل اور ایمان مفصّل کے مندرجہ بالا الفاظ جو سلف سے منقول ہیں، حد درجہ موزوں بھی ہیں اور نہایت جامع و مانع بھی۔ اس لیے کہ ان میں ایمانیات کی تفصیل کے علاوہ دو اہم اور بنیادی نکتے بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایمان زبانی اقرار (جو اُس قانونی ایمان یعنی اسلام کا رکن اولین ہے جس پر تمام دنیوی معاملات کا دارومدار ہے اور جس پر اسلامی ہیئت اجتماعی کی بنیاد قائم ہوتی ہے) اور تصدیق قلبی (جس پر اُس حقیقی ایمان کا دارومدار ہے جس کی بناء پر آخرت میں کوئی شخص مومن قرار پائے گا) دونوں کا مجموعہ ہے اور دوسرے یہ کہ علمی ونظری اور اصولی اعتبار سے ایمان حقیقتاً ایمان باللہ ہی کا نام ہے۔ بقیہ تمام ایمانیات اسی اصل کی فروع اور اسی اجمال کی تفصیل ہیں۔ چنانچہ ایمان بالآخرت بھی اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حکمت وعدل ہی کا مظہر ہے اور

ایمان بالرسالت بھی اس کی صفاتِ ربوبیت وہدایت ہی کی توسیع ۔

اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ اَلْاَحَــدُ ہے یعنی ہر اعتبار سے تنہا اور اکیلا' چنانچہ نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے نہ صفات میں' نہ حقوق میں نہ اختیارات میں' نہ اس کا کوئی ہم جنس ہے نہ ہم کفو' نہ ہم سر ہے نہ ہم پلّہ' نہ ضد ہے نہ ند' نہ مثل ہے نہ مثال۔ وہ الصَّمَد ہے یعنی وہ پورے سلسلہ کون ومکان کا مبدع بھی ہے اور موجد بھی' خالق بھی ہے اور باری بھی' صانع بھی ہے اور مصور بھی' اور اسی کی توجہ وعنایت اسے تھامے ہوئے بھی ہے اور قائم کیے ہوئے بھی۔

وہ پاک اور منزہ ومبرا ہے ہر عیب' ہر نقص' ہر کمی' ہر ضعف' ہر احتیاج' ہر غلطی اور ہر کوتاہی سے۔ گویا وہ سبُّوح بھی ہے اور القُدّوس بھی — اور جامع ہے تمام محاسن وکمالات کا' اور ہر خیر اور خوبی کا بدرجہ تمام وکمال' گویا وہ الغنی بھی ہے اور الحمید بھی۔ کسی کو کوئی قوت و طاقت حاصل نہیں بجز اس کے اذن واجازت کے' گویا وہی' العَلِیّ بھی' العظیم بھی' المُتَعَال بھی ہے اور الکبیر' المُتَکَبّر بھی۔ ''سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰــهَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ ''۔

اس کی ذات وراءُالوراء ثم وراءُالوراء ہے اور اس کی ماہیت اور کنہہ کو کوئی نہیں جان سکتا' اور اس کی معرفت کی واحد راہ اس کے اسماء وصفات کے واسطے ہی سے ہے۔ چنانچہ تمام اچھے نام اسی کے ہیں اگرچہ متعین طور پر اس کے اسماءِ حسنیٰ وہی ہیں جو قرآن اور حدیث نبویؐ میں وارد ہوئے۔ اسی طرح وہ تمام صفات کمال سے بتمام وکمال متصف ہے جن میں سے اہم ترین آٹھ ہیں یعنی (۱) حیات' (۲) علم' (۳) قدرت' (۴) ارادہ' (۵) سمع' (۶) بصر' (۷) کلام اور (۸) تکوین۔ چنانچہ وہی الحَیّ بھی ہے اور القَیُّوم بھی' السَّمِیع بھی ہے اور البصیر بھی' ''عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیر '' بھی ہے اور ''بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْم'' بھی ''فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْد '' بھی ہے اور ''اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْن'' کی شان کا حامل بھی۔ مزید برآں اس کی جملہ صفات اس کی ذات ہی کے مانند مطلق ولامتناہی ہیں نہ کہ محدود ومقید' اور قدیم ہیں نہ کہ حادث' اور ذاتی ہیں نہ کہ کسی اور کی عطا کردہ۔

فرشتے وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نور سے تخلیق فرمایا۔ وہ صاحب تشخص وجود کے حامل ہیں نہ کہ مجرد قوائے طبیعیہ۔ ان کا نہ مذکر ہونا معلوم ہے نہ مؤنث۔ وہ

خدا سے قرب ضرور رکھتے ہیں لیکن الوہیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ وہ اللہ کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم انہیں بارگاہِ خداوندی سے ملے۔ وہ اللہ کے احکام کی تنفیذ بھی کرتے ہیں اور خالق ومخلوق کے مابین پیغام رسانی بھی' چنانچہ وہی انبیاء ورُسل تک وحی لاتے رہے ہیں۔ ان کی تعداد بے شمار ہے لیکن چار بہت مشہور بھی ہیں اور جلیل القدر بھی یعنی حضرت جبرئیل' حضرت میکائیل' حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام۔

اللہ کی کتابوں میں سے بھی چار ہی معلوم ومعروف ہیں' یعنی توراۃ جو حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوئی اور زبور جو حضرت داؤدؑ کو عطا ہوئی اور انجیل جو حضرت عیسیٰؑ کو عطا ہوئی اور قرآن جو حضرت محمد ﷺ کو عطا ہوا' جو اللہ کی آخری کتاب اور نوعِ انسانی کے نام اللہ کا آخری اور مکمل پیغام ہے' جس کے بعد کوئی اور کتاب نازل نہ ہوگی اور جو من وعن محفوظ موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا جبکہ باقی تینوں کتابیں ردوبدل اور تغیر وتحریف کا ہدف بن چکی ہیں' گویا اب قرآن ہی اُن کا مُصَدِّق بھی ہے اور مُھَیْمِن بھی۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے پیغمبروں کے صحیفے عطا ہوئے جن میں سے کچھ اب دنیا میں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں' باقی محرف اور مبدل ہیں۔

اللہ کے رسول نوعِ انسانی کے وہ برگزیدہ افراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے وقتاً فوقتاً چنا اور پسند فرمایا۔ وہ انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے اور سب گناہ سے پاک یعنی معصوم تھے۔ ان کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے' قرآن مجید میں جن کے نام مذکور ہیں ان کے سوائے کسی اور کو یقین کے ساتھ نبی یا رسول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان میں سے پانچ حد درجہ اولوالعزم اور نہایت عالی مرتبہ ہیں یعنی حضرت نوح علیہ السلام' حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سیدنا محمد ﷺ۔ ان میں سے بعض کو بعض پر بعض پہلوؤں سے جزوی فضیلت حاصل ہے لیکن جملہ انبیاء ورُسل پر فضیلت کلی سیدِ وُلدِ آدم حضرت محمد ﷺ کو حاصل ہے' جو خاتم النبیین بھی ہیں اور آخر الرسل بھی اور جن کے بعد وحی نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کلی طور پر بند ہو چکا ہے۔

انبیاء ورُسل کی تائید وتقویت کے لیے اللہ تعالیٰ عام مادی ضوابط کو عارضی طور پر معطل کر کے گویا عادی قانون کو توڑ کر اپنی آیات ظاہر کرتا اور معجزات دکھاتا رہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو بھی بے شمار حسی معجزے عطا ہوئے لیکن آپ کا اہم ترین اور عظیم ترین معجزہ معنوی ہے یعنی قرآن حکیم۔

یوم آخر وہ دن ہے جس میں تمام انسان دوبارہ زندہ ہوکر عدالت خداوندی میں محاسبے اور جزا وسزا کے فیصلے کے لیے پیش ہوں گے' جس کے نتیجے میں یا جنت میں داخلہ ہوگا یا جہنم میں۔ اس دن اقتدار مطلق اور اختیار کلی صرف اللہ واحد وقہار کے ہاتھ میں ہوگا۔ نہ کسی کو کسی جانب سے کوئی مدد مل سکے گی' نہ کوئی کچھ دے دلا کر چھوٹ سکے گا' نہ کوئی سفارش ہی خدا کی پکڑ سے بچا سکے گی۔ انبیاء ورُسل' صلحاء واتقیاء' ملائکہ وارواح اور سب سے بڑھ کر نبی اکرم ﷺ کے مراتبِ عالیہ کے اظہار واعلان اور ان کے اعزاز واکرام کے لیے شفاعت کی اجازت دی جائے گی اور گناہ گار اہل ایمان کے حق میں ان کی شفاعت قبول بھی ہوگی لیکن نہ وہ خدا کی مرضی اور منشاء کے خلاف کچھ کہیں گے اور نہ ہی خدا کی صفت عدل باطل ہوگی۔

تقدیر کے خیر وشر کا من جانب اللہ ہونا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور مخلوقات میں سے کسی کے بس میں نہیں کہ بغیر اس کی اجازت محض اپنے ارادے سے کچھ کر سکے۔ لہٰذا یہاں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے' خواہ وہ کسی کو بھلا لگے یا بُرا' اللہ کے اذن ہی سے ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو خدا کا عاجز ولاچار ہونا لازم آتا ہے۔ مزید برآں' وہ "عَالِمُ مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ" بھی ہے۔ چنانچہ اس پورے سلسلہ کون ومکان میں جو کچھ ماضی میں ہوا' یا حال میں ہو رہا ہے یا مستقبل میں ہوگا سب اس کے علم قدیم میں پہلے سے موجود ہے' اگرچہ اس کا یہ علم جبرِ محض کو مستلزم نہیں۔ گویا' ایمان بالقدر دراصل اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی قدرت اور علم کے مضمرات اور مقدرات ہی کو ماننے کا نام ہے۔

بعث بعد الموت سے مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا نفخہ اُولیٰ ہوگا' جس کے نتیجے میں کائنات کا پورا موجودہ نظام درہم برہم ہوجائے گا اور سب پر ایک عمومی موت طاری ہوجائے گی۔ پھر جب اللہ کا اذن ہوگا نفخہ ثانیہ ہوگا اور سب جی اُٹھیں گے اور حضرت آدم ﷺ سے لے کر تا قیامِ قیامت پیدا ہونے والے آخری انسان تک سب میدان حشر میں جمع کیے جائیں گے!

(ب) کلمہ طیبہ "لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کے جملہ مضمرات و مقدرات کے فہم وشعور کے ساتھ گواہی دے کہ:

"اَشْهَدُ اَنْ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں'

وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔

تشریح: اس شہادت کے جزو اوّل کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان اور جو کچھ آسمان و زمین میں ہے سب کا خالق، پروردگار، مالک اور تکوینی و تشریعی حاکم صرف اللہ ہے۔ ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ گویا "اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" اور "لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ"

اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ:

۱۔ انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی و کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا، فریاد رس اور حامی و ناصر نہ سمجھے، کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہے ہی نہیں۔

۲۔ اللہ کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقویٰ اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی سے اُمیدیں وابستہ نہ کرے، کیونکہ تمام اختیارات کا مالک تنہا وہی ہے۔

۳۔ اللہ کے سوا کسی سے دُعا نہ مانگے، کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے، کسی کو مدد کے لیے نہ پکارے۔ کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخیل اور زور آور بھی نہ سمجھے کہ اس کی سفارش قضائے الٰہی کو ٹال سکتی ہو، کیونکہ خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں، خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء۔

۴۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے، کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر نہ دے اور کسی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں، کیونکہ تنہا ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔

۵۔ اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ تسلیم نہ کرے، کسی کو باختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے، کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے اور اُن تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے جو ایک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت اور اُس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں، کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا۔

نیز اس عقیدے کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ:

٦۔ انسان اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جائے، اپنی خواہش نفس کی بندگی چھوڑ

دے اور اللہ کا بندہ بن کر رہے جس کو اس نے الٰہ تسلیم کیا ہے۔

۷۔ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک مختار نہ سمجھے، بلکہ ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان، اپنے اعضاء اور اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی ملک اور اس کی طرف سے امانت سمجھے۔

۸۔ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اُسے قیامت کے روز اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔

۹۔ اپنی پسند کا معیار اللہ کی پسند کو اور اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے۔

۱۰۔ اللہ کی رضا اور اس کے قرب کو اپنی تمام سعی و جہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھہرائے۔ گویا اللہ تعالیٰ ہی اس کا محبوب حقیقی اور مطلوب و مقصود اصلی بن جائے۔

۱۱۔ اپنے لیے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، معیشت اور سیاست میں، غرض زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت تسلیم کرے اور ہر اُس طریقے اور ضابطے کو رد کر دے جو اللہ کی شریعت کے خلاف ہو۔

اس شہادت کے جزوِ ثانی سے واضح ہوتا ہے کہ سیدِ وُلدِ آدم نبی اکرم ﷺ کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ اللہ کے بندے ہیں اور دوسرے یہ کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ پہلی حیثیت کے اعتبار سے آپ عبدیت کاملہ کے مقام پر فائز ہیں اور آپؐ کی اس حیثیت کے علم اور اعتراف سے شرک کی ان جملہ اقسام کا کامل سدّ باب ہو جاتا ہے جن میں سابقہ امّتیں اپنے اپنے انبیاء و رُسل کے فرطِ احترام، شدتِ عقیدت اور غلو محبت کے باعث ملوث ہو گئیں۔ دوسری حیثیت کے اعتبار سے آپؐ کے فرقِ مبارک پر ختمِ نبوت اور ختمِ رسالت کا تاج بھی ہے اور آپؐ کے دستِ مبارک میں شہنشاہِ ارض و سماء کی جانب سے اِتمامِ نعمتِ شریعت اور تکمیلِ دینِ حق کا فرمانِ شاہی بھی۔ گویا سلطانِ کائنات کی طرف سے رُوئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبیؐ کے ذریعہ سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطہ قانون بھیجا گیا اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام کر کے ایک مکمل نمونہ قائم کر دینے پر مامور کر دیا گیا، وہ محمد ﷺ ہیں۔

اس امرِ واقعی کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان کو جملہ مخلوقات میں شدید ترین محبت آنحضور ﷺ ہی سے ہو اور آپؐ کی اطاعت اور اتباع ہی زندگی کا اصل طریق بن جائے۔ گویا:

۱۔ انسان ہر اُس تعلیم اور ہر اُس ہدایت کو بے چون و چرا قبول کرے جو محمد ﷺ سے ثابت ہو۔

۲۔ اس کو کسی حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لیے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روک دینے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رسولِ خدا ﷺ سے ثابت ہے۔

۳۔ رسولِ خدا ﷺ کے سوا کسی کی مستقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے۔ دوسرے انسانوں کی پیروی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے تحت ہو' نہ کہ ان سے آزاد۔

۴۔ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں خدا کی کتاب اور اُس کے رسولؐ کی سُنّت کو حجت اور سند اور مرجع قرار دے۔ جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب و سنت کے مطابق ہو اسے اختیار کرے' جو اس کے خلاف ہو اسے ترک کر دے' اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اسے حل کرنے کے لیے اُسی سرچشمہ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔

۵۔ تمام عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی' یا قبائلی و نسلی' یا قومی و وطنی' یا فرقی و گروہی کسی کی محبت یا عقیدت میں ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسولِؐ خدا کے لائے ہوئے حق کی محبت و عقیدت پر وہ غالب آ جائے یا اس کی مدِّ مقابل بن جائے۔

۶۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد پیدا ہونے والے کسی شخص کو نہ تو کسی بھی معنی میں نبی یا رسول سمجھے نہ معصوم اور نہ ہی کسی کا یہ منصب اور مرتبہ سمجھے کہ اس کے ماننے پر انسان کا مومن و مسلم سمجھا جانا منحصر ہو۔

نیز اسی کے متضمّنات کی حیثیت سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ:

۷۔ یہ تسلیم کیا جائے کہ آپؐ نے جو نظام قائم فرمایا اور جو خلافتِ راشدہ کے دوران بتمام و کمال قائم رہا' وہی ''دین حق' اور ''نظام اسلامی'' کی صحیح ترین اور واحد مسلّمہ تعبیر ہے۔ گویا خلافتِ راشدہ فی الواقع ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' تھی اور خلفائے اربعہ یعنی حضرات ابوبکر صدیق' عمر فاروق' عثمان غنی اور علی حیدر رضی اللہ تعالیٰ عنهم وارضاهم نبی اکرم ﷺ کے وہ ''خلفائے راشدین ومہدیین'' ہیں جن کی سنت آنحضور ﷺ کے بعد دین میں حجت کا درجہ رکھتی ہے۔

۸۔ یہ یقین رکھا جائے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جنہیں آنحضور ﷺ کی صحبت اور آپؐ کی تعلیم اور تزکیہ و تربیت سے براہِ راست فیض یاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی' من حیثیت الجماعت پوری اُمت میں افضلیت مطلقہ کے حامل ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی

غیر صحابی کسی صحابی سے افضل نہیں ہوسکتا۔ ان کی محبت جزو ایمان ہے' ان کی تعظیم و توقیر دراصل نبی اکرم ﷺ کی تعظیم و توقیر ہے اور ان سے بغض و عداوت اور ان کی تحقیر و توہین درحقیقت آنحضور ﷺ سے بغض و عداوت اور آپ ؐ کی تحقیر و توہین ہے۔ ان کے مابین جزوی فضیلت کے بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں لیکن فضیلت کلّی متعین طور پر اس طرح ہے کہ تمام صحابہؓ میں ایک اضافی درجۂ فضیلت حاصل ہے حضراتِ اصحاب بیعت رضوان کو' پھر ان پر ایک مزید درجہ فضیلت حاصل ہے حضرات اصحاب بدر کو' پھر ان پر ایک اور درجہ فضیلت کے حامل ہیں حضرات عشرۂ مبشرہ اور ان میں فضیلت مطلقہ حاصل ہے حضراتِ خلفاء اربعہ کو جن کی افضلیت علیٰ ترتیب الخلافت ہے یعنی افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ' پھر درجہ ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا' پھر مقام ہے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا اور پھر مرتبہ ہے حضرت علی حیدر رضی اللہ عنہ کا!

مزید برآں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کل کے کل ''عدول'' ہیں اور ان کے مابین اختلاف و نزاع نفسانیت کی بناء پر نہیں بلکہ خطائے اجتہادی کی بنا پر ہوا۔ چنانچہ مشاجراتِ صحابہؓ کے باب میں محتاط ترین روش تو یہ ہے کہ ''کَفِّ لِسان'' سے کام لیا جائے اور کامل سکوت اختیار کیا جائے تاہم کوئی حقیقی اور واقعی ضرورت ہی لاحق ہو جائے تو ایک کو ''مُصیب''، یعنی صحیح مؤقف پر اور دوسرے کو ''مُخطِی''، یعنی راہِ خطائے اجتہادی پر تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن کسی کو بھی سبّ و شتم یا الزام و اتہام کا ہدف بنانا جائز نہیں ہے!

(ج) ہر قسم کے کفر اور جملہ انواع و اقسام شرک اور تمام رذائل و ذمائم اخلاق سے شعوری طور پر اعلانِ براءت کرے' بایں الفاظ کہ:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ شَیْئًا وَّ اَنَا اَعْلَمُ بِهٖ وَاَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا اَعْلَمُ بِهٖ تُبْتُ عَنْهُ وَتَبَرَّاْتُ مِنَ الْکُفْرِ وَالشِّرْكِ وَالْکِذْبِ وَالْغِیْبَةِ وَالْبِدْعَةِ وَالنَّمِیْمَةِ وَالْفَوَاحِشِ وَالْبُھْتَانِ وَالْمَعَاصِیْ کُلِّھَا۔

''اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تیرے ساتھ کسی کو جانتے بوجھتے شریک کروں اور تجھ سے مغفرت کا طلب گار ہوں اگر کبھی بے سمجھے بوجھے ایسا ہو جائے اور میں اعلان براءت کرتا ہوں ہر نوع کے کفر سے' شرک سے' جھوٹ سے' غیبت سے' بدعت سے' چغل خوری سے' بے حیائی

کے کاموں سے‘ بہتان طرازی سے اور جملہ نافرمانیوں سے۔‘‘

تشـــریح :ایمان کی طرح کفر کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک کفرِ حقیقی یا کفرِ قلبی اور دوسرے کفرِ قانونی یا کفرِ ظاہری۔ کفرِ حقیقی یا کفرِ قلبی کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری و ناشکری اور اس کی ہر معصیت اور ہر نافرمانی پر ہو جاتا ہے لیکن جہاں تک اُس کفرِ قانونی یا کفرِ شرعی کا تعلق ہے جس کی بناء پر کسی کی تکفیر کر کے اس کا رشتہ ملتِ اسلامی سے منقطع کر دیا جائے تو وہ ضروریات دین میں سے کسی کے انکار ہی سے لازم آتا ہے‘ مجرد بے عملی یا نافرمانی حتیٰ کہ کبائر کے ارتکاب سے بھی لازم نہیں آتا۔

اسی طرح شرک کی بھی بے شمار اقسام ہیں۔ بعض شرک اعتقادی ہیں اور بعض صرف عملی‘ بعض جلی ہیں اور بعض خفی۔ تاہم جملہ انواع و اقسامِ شرک کا ایک احصاء اور احاطہ اس طرح ممکن ہے کہ ایک شرک فی الذات ہے یعنی یہ کہ کسی کو کسی اعتبار سے خدا کا ہم جنس یا ہم کفو بنا دیا جائے جس کا کامل رد ہے سورہ اخلاص میں۔ دوسرے شرک فی الصفات ہے یعنی کسی کو کسی صفت کے اعتبار سے خدا کا مثل یا مثیل بنا دیا جائے جس کا نہایت مکمل سد باب ہے آیت الکرسی میں۔ اور تیسرے شرک فی الحقوق ہے جس کی جامع ترین تعبیر شرک فی العبادت ہے جس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کوئی خدا سے بڑھ کر یا اُس جتنا محبوب و مطلوب ہو جائے اور یہ بھی کہ کسی کو علی الاطلاق مطاع مان لیا جائے یعنی اس کی اطاعت خدا کی اطاعت سے آزاد تسلیم کر لی جائے‘ اور یہ بھی کہ عام مادی قانون اور ظاہری قواعد و ضوابط کے دائرے سے باہر کسی سے استعانت اور استمداد و استغاثہ کیا جائے یا اس سے دُعا کی جائے اور اسے پکارا جائے (عام مادی قوانین کے تحت بھی اگر کسی کے بارے میں یہ خیال ہو کہ محض اپنی قوت اور ارادے سے کسی کو نفع یا ضرر پہنچا سکتا ہے تو یہ شرک فی الصفات کی ایک قسم یعنی شرک فی القدرت اور شرک فی التصرف ہوگا)۔ مزید برآں شرک کی اسی نوع کے ذیل میں آتے ہیں ریا اور سمعہ بھی اور کسی کے لیے کسی بھی نیت سے ان مراسم عبودیت کو بجالانا بھی جو صرف اللہ کے لیے خاص ہیں جیسے سجدہ اور نذر!

رذائل و ذمائم اخلاق کی مکمل فہرست دینا ممکن نہیں‘ تاہم اگر انسان ان سے اجتناب کرے جو اُوپر بیان ہوئے تو دوسروں کا سد باب خود بخود ہو جائے گا۔

(د) سابقہ زندگی کے تمام گناہوں پر نہایت الحاح و زاری سے بارگاہِ

خداوندی میں مغفرت کا طلب گار ہو اور آئندہ کے لیے کامل خلوص و اخلاص کے ساتھ توبہ کرے' ان الفاظ کے ساتھ کہ:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّی مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ اَذْنَبْتُہٗ عَمَدًا اَوْ خَطَأً سِرًّا اَوْ عَلَانِیَۃً وَّ اَتُوْبُ اِلَیْہِ مِنَ الذَّنْبِ الَّذِیْٓ اَعْلَمُ وَمِنَ الذَّنْبِ الَّذِیْ لَا اَعْلَمُ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ وَسَتَّارُ الْعُیُوْبِ وَغَفَّارُ الذُّنُوْبِ

''میں اللہ سے معافی کا خواستگار ہوں تمام گناہوں پر خواہ میں نے جان بوجھ کر کیے ہوں یا غیر ارادی طور پر' اور خواہ چھپ چھپا کر کیے ہوں خواہ علانیہ طور پر' اور خواہ وہ میرے علم میں ہوں خواہ میرے علم میں نہ ہوں۔ اے اللہ تو ہی تمام غیبوں کا جاننے والا اور تمام عیبوں کی پردہ پوشی کرنے والا اور تمام گناہوں کی بخشش فرمانے والا ہے!''

تشریح: توبہ صرف زبان سے کلماتِ توبہ کے ادا کر دینے یا ان کے ورد یا وظیفہ بنا لینے کا نام نہیں ہے بلکہ گناہ پر حقیقی ندامت اور واقعی پشیمانی اور معصیت سے کلی اجتناب کے عزمِ مصمّم کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں رجوع کرنے اور گناہ ومعصیت کو بالفعل ترک کر دینے کا نام ہے۔ یہ تین شرائط ان کوتاہیوں کے ضمن میں کافی ہیں جو حقوق اللہ کے باب میں ہوں۔ حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے معاصی کے لیے ایک چوتھی اضافی شرط یہ ہے کہ جس کسی پر زیادتی ہوئی ہو اس کی تلافی کی جائے یا اس سے معافی حاصل کی جائے۔

بنابریں توبہ کی صحت کے لیے لازم ہے کہ جو شخص تنظیمِ اسلامی میں شمولیت کا خواہاں ہو وہ:

۱۔ جملہ فرائض دینی کی پابندی اختیار کرے اور تمام کبائر سے فی الفور مجتنب ہو جائے' بالخصوص ارکان اسلام کی پوری پابندی کرے۔ چنانچہ نماز قائم کرے (مردوں کے لیے التزام جماعت بھی ضروری ہے)' رمضان المبارک کے روزے رکھے' صاحبِ نصاب ہو تو باقاعدہ حساب کے ساتھ پوری زکوٰۃ ادا کرے اور صاحبِ استطاعت ہو اور تاحال حج بیت اللہ نہ کیا ہو تو فوراً نیت کرے اور جلد از جلد فریضہ حج ادا کرے۔

۲۔ سنت رسول ﷺ کا زیادہ سے زیادہ اتباع کرے اور ایسی تمام بدعات اور رسومات کو ترک کر دے جن کا ثبوت قرونِ مشہود لہا بالخیر میں نہ ملتا ہو۔

تشــریح :ان بدعات ورسومات کا زیادہ زور شادی بیاہ' پیدائش' عقیقہ' ختنہ' سالگرہ' فوتید گی اور تیوہاروں کے مواقع پر ہوتا ہے۔ ان سب میں لازم ہوگا کہ اپنے معاملات کو زیادہ سے زیادہ قرونِ اولیٰ کے مطابق بنایا جائے اور بعد کے اضافوں کو ترک کر دیا جائے۔

۳۔ اپنی معاشرت میں جملہ اسلامی احکام کی پابندی کرے خصوصاً ستر اور حجاب کے شرعی احکام پر عمل پیرا ہو۔

۴۔ اگر کوئی ایسا ذریعہ معاش رکھتا ہو جو معصیت فاحشہ کے ذیل میں آتا ہو جیسے چوری' ڈاکہ' سود' زنا' شراب' رقص وسرود' شہادتِ زُور' رشوت' خیانت' جوا اور سٹہ وغیرہ تو اسے ترک کر دے۔

تشریح :اس بات کا تو بظاہر احوال کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ وہ لوگ تنظیم اسلامی میں شمولیت کے خواہاں ہوں جن کی معاش چوری یا ڈاکہ' شراب کی تیاری یا اس کی فروخت وغیرہ' عصمت فروشی یا رقص وسرود ایسے قبیح کاموں سے متعلق ہوں' تاہم اگر اللہ تعالیٰ ایسے کسی کاروبار سے متعلق کسی فرد کو اصلاح کی توفیق دے تو یہ بھی اُس کی رحمت سے بعید نہیں۔ بہرصورت ان تمام کاموں کی حرمت اور قباحت وشناعت ہمارے معاشرے میں معلوم ومعروف ہے —— البتہ بعض حرام چیزیں کچھ اس طرح ہمارے معاشرے میں جاری وساری ہوگئی ہیں کہ عام لوگ یا تو ان کی قباحت سے ہی آگاہ نہیں رہے یا انہوں نے کسی مجبوری کے عذر کی بنیاد پر اُن کو اپنے لیے مباح کر لیا ہے۔ ان میں سے مکروہ ترین چیز ہے سُود' جس سے باز نہ آنے پر قرآن حکیم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے اعلان جنگ کی وعید سناتا ہے اور دوسرے نمبر پر ہے رشوت اور سرکاری حیثیت اور اختیار کا ناجائز استعمال اور ان پر مستزاد ہیں بیع وشرا کی بعض ناجائز صورتیں اور سرکاری محاصل (انکم ٹیکس' کسٹم ڈیوٹی وغیرہ) سے بچنے کے لیے اِخفاء وکذب بیانی۔

ہمیں خوب اندازہ ہے کہ اس وقت جو خدا ناشناس اور عاقبت ناآشنا نظام پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے اور پورا انسانی معاشرہ بحیثیت مجموعی جس فسادِ اخلاقی میں مبتلا ہے اس کے پیش نظر ان تمام چیزوں سے کامل اجتناب نہایت مشکل اور صبر آزما کام ہے لیکن تنظیم اسلامی جن مقاصد کے لیے قائم کی جارہی ہے اس کے پیش نظر لازم ہے کہ اس سے عملی وابستگی کے لیے وہی لوگ آگے بڑھیں جو رخصتوں اور حیلوں پر عمل کرنے کے بجائے عزیمت اور صبر وتوکل کو اپنا شعار بنائیں اور ہر اس ذریعہ معاش کو ترک کرنے کی کوشش کریں جس میں

حرام کی آمیزش ہو۔ اس معاملے میں سردست حسب ذیل تصریحات پر اکتفا کی جاتی ہے:

(i) سود لینا اور دینا قطعاً حرام ہیں لہٰذا بنکوں یا دیگر اداروں سے نہ کبھی کوئی رقم کسی بھی غرض کے لیے سود پر قرض لینا جائز ہے نہ سیونگ اکاؤنٹ یا فکسڈ ڈیپازٹ یا نقد رقم پر معینہ منافع کی کسی بھی دوسری صورت میں سرمایہ لگانا درست ہے۔ چنانچہ بنکوں سے صرف عام سروسز جیسے ترسیل زر یا لاکرز سے انتفاع یا زیادہ سے زیادہ کرنٹ اکاؤنٹ رکھنے کی سہولت حاصل کی جا سکتی ہے۔

(ii) کسی ایسے کاروباری ادارے کی ملازمت جائز نہیں ہے جس میں سود کو غالب عنصر کی حیثیت حاصل ہو، جیسے بنک اور انشورنس کمپنیاں۔

(iii) رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔ البتہ کسی ایسی صورت میں کہ کسی ظالم اہل کار یا صاحب اختیار کو اپنا جائز حق وصول کرنے کے لیے کچھ مجبوراً دینا پڑے تو اس کا شمار استحصال بالجبر میں ہوگا، رشوت میں نہیں۔ البتہ یہ صرف اُسی صورت میں ہوگا کہ نہ کوئی ناجائز انتفاع مطلوب ہو، نہ کسی سرکاری قانون اور پابندی سے بچنا مقصود ہو اور نہ ہی کسی اور کے جائز حقوق پر زد پڑتی ہو۔

(iv) سرکاری محاصل کے ضمن میں جتنی رعائتیں مروجہ قانون کے اندر اندر ممکن ہوں ان سے بڑھ کر کسی ایسی صورت کو اختیار کرنا درست نہیں ہے جس میں کذب، فریب اور شہادت زُور شامل ہوں۔

(v) کاروبار کی مختلف صورتوں میں سے بھی جن جن میں بیع فاسد یا جوئے یا سٹے یا احتکار وغیرہ کا عنصر شامل ہو اس سے بچنا لازم ہے۔

(vi) اگر اس کے قبضے میں ایسا مال یا جائیداد ہو جو حرام طریقے سے آیا ہو یا جس میں حق داروں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے دستبردار ہو جائے اور اہل حقوق کو ان کے حق پہنچا دے۔ البتہ یہ عمل صرف اس صورت میں کرنا لازم ہے جب کہ حق دار بھی معلوم ہوں اور وہ مال بھی معلوم و متعین ہو جس میں ان کا حق تلف ہوا ہے۔ بصورت دیگر توبہ اور آئندہ کے لیے طرز عمل کی اصلاح کافی ہوگی۔

(۶) گہرے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرے کہ وہ ہر طرف سے یکسو ہو کر صرف اللہ کا ہو کر رہے گا، رضائے الٰہی ہی اس کا اصل مقصود و

مطلوب ہوگی اور نجات وفلاحِ اُخروی کا حصول ہی اس کا اصل نصبُ العین ہوگا —— اور جس طرح اس کی نماز اور قربانی صرف اللہ کے لیے ہوگی اسی طرح اس کے جسم وجان' مال ومنال حتیٰ کہ زندگی اور موت سب اللہ ہی کے لیے ہوں گے۔یعنی:

اِنِّی وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ — اور — اِنَّ صَلَاتِی وَ نُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ

تشریح : ہر ذی شعور مسلمان کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اپنی پوری زندگی اس کی کامل اطاعت میں دے دے (جو لازماً اطاعتِ رسولؐ ہی کے واسطے سے ہوگی)! اسی رویے کا نام عبادتِ رب ہے جو ہر انسان سے اللہ کا پہلا مطالبہ ہے اور جس کی طرف نوعِ انسانی کو دعوت دینے کے لیے تمام انبیاء ورسل مبعوث ہوئے اور جو ازروئے قرآن جنوں اور انسانوں کا عین مقصدِ تخلیق ہے۔اس کے ساتھ ہی اس پر لازم ہے کہ اپنی صحت وقوت' فرصت و فراغت' صلاحیت واستعداد' مال ودولت' اور وسائل وذرائع کا زیادہ سے زیادہ حصہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' احقاقِ حق اور ابطالِ باطل' دعوت الی اللہ اور تبلیغ دین' نصرتِ خدا اور رسولؐ اور حمایت واقامتِ دین' اور شہادتِ حق علی الناس اور اظہارِ دین حق علی الدین کلّہٖ کے لیے وقف کر دے اور اس کے لیے محنت ومشقت' انفاق وایثار' ترک واختیار' ابتلا وآزمائش' صبر ومصابرت' استقامت ومقاومت' الغرض ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کے جملہ مراحل کے لیے مقدور بھر ہمت وعزیمت کی راہ اختیار کرے۔ یہ تمام فرائض ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت واستعداد اور مطابقِ وسعت وقوت عائد ہوتے ہیں اور ان کی انجام دہی میں ہی بندے کی وفاداری کا اصل امتحان ہے!

(و) خدا کو حاضر وناظر جانتے ہوئے اور ''اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا'' کے پیش نظر پورے احساسِ مسئولیت کے ساتھ عہد کرے کہ اپنے فرائضِ دینی کی انجام دہی کے لیے وہ نبی اکرم ﷺ کے فرمان مبارک ''اَنَـا اٰمُرُكُمْ

بِـخَـمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰہِ'' کے مطابق تنظیم اسلامی کے نظم کی پوری پابندی کرے گا۔

تشـــــریح : یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ تنظیم اسلامی نہ عام معنی میں دنیوی یا سیاسی جماعت ہے نہ محدود مفہوم میں مذہبی تنظیم بلکہ یہ ایک ہمہ گیر ''دینی جماعت'' ہے۔ لہٰذا اگرچہ یہ خیال کرنا تو غلطی ہی نہیں عظیم گمراہی ہوگی کہ یہ اُس ''الجماعت'' کے حکم میں ہے جس میں شمولیت اسلام میں داخلے اور جس سے علیحدگی کفر کے مترادف ہے اور جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ ''یعنی جو اس سے علیحدہ ہوگا وہ علیحدہ ہی جہنم میں جھونک دیا جائے گا —— تاہم اس کے نظم کو عام معاشرتی وثقافتی انجمنوں یا طبقاتی و پیشہ ورانہ تنظیموں یا سیاسی وقومی جماعتوں کے قواعد وضوابط کی پابندی پر بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کی ''اطاعت فی المعروف'' —— ''سمع وطاعت'' کے خالص اسلامی اور ٹھیٹھ دینی اُصول کے مطابق تمام شرکائے تنظیم پر واجب ہے۔

❀ ❀ ❀

حصہ سوم

فرائض دینی

کا

جامع تصور

جو

مارچ ۱۹۸۵ء میں مسلسل چھ روز

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے سالانہ محاضراتِ قرآنی میں زیر بحث رہا

(بعض لفظی ترامیم کے ساتھ)

ڈاکٹر اسرار احمد

بانی تنظیم اسلامی

دینی فرائض کا جامع تصور

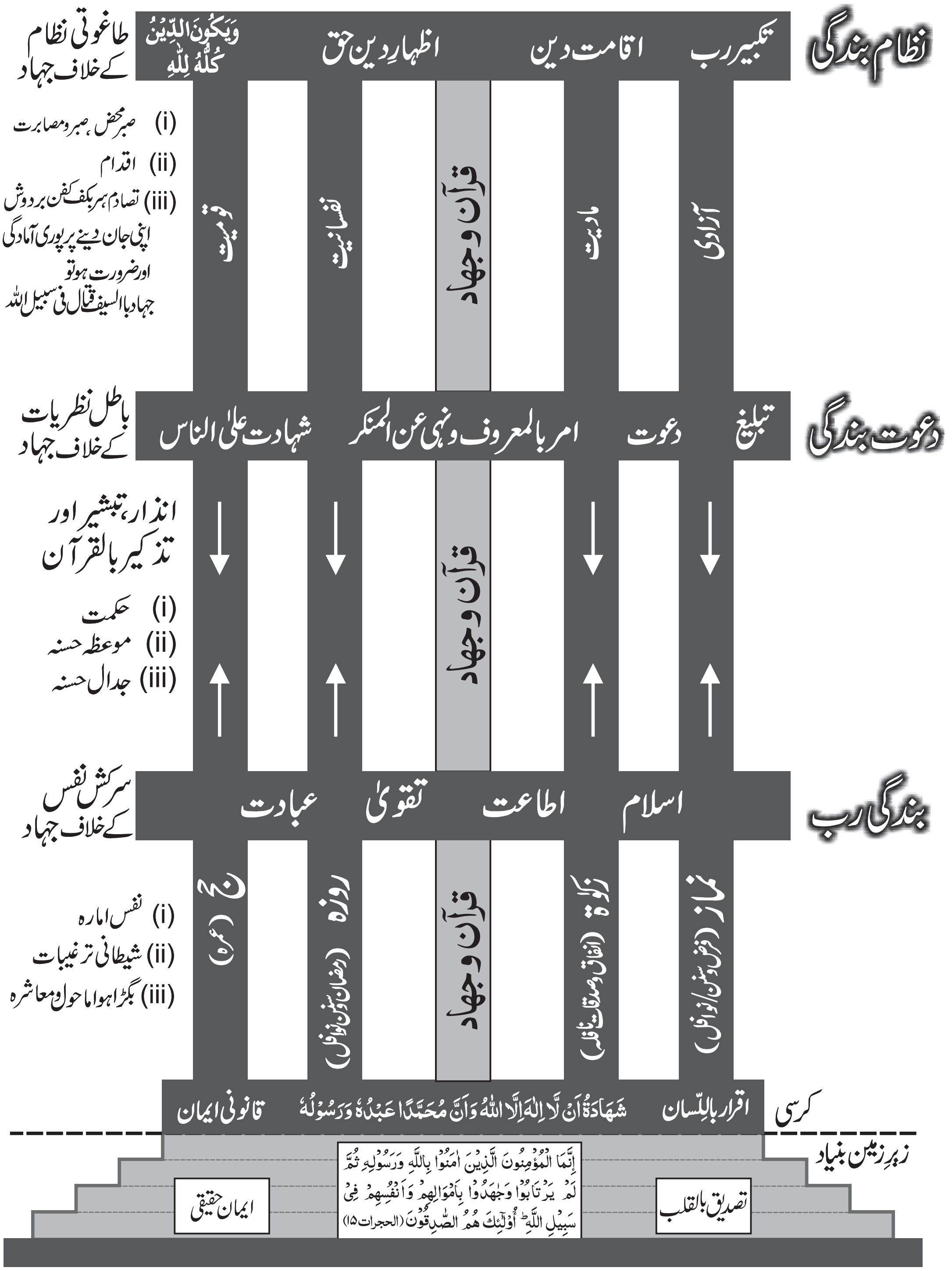

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرائض دینی کا جامع تصور

● تمہید: علم اور عمل

انسانی شخصیت کے دو رُخ ہیں: ایک علم، دوسرے عمل۔ اسلام میں علم صحیح کا مظہرِ اَتم ''ایمان'' ہے جبکہ عمل صحیح کی اساس ''تصور فرائض'' پر قائم ہے۔ ایمان انسان کو علم حقیقت ہی عطا نہیں فرماتا، صحیح محرک عمل بھی دیتا ہے۔ اس اعتبار سے اوّلین اہمیت اسی کی ہے۔ چنانچہ ایمان کی ماہیت، اس کی تفاصیل، اس کے درجات، اس کے حصول کے ذرائع اور اس کے لوازم و ثمرات اہم ترین موضوعات ہیں لیکن موجودہ محاضرات میں اصل بحث ان پر نہیں بلکہ ''تصورِ فرائض دینی'' پر ہے!

● تین اساسی فرائض

ایک مسلمان کے اساسی دینی فرائض تین ہیں:

(۱) وہ خود صحیح معنی میں اللہ کا بندہ بنے!

- اس کے لیے چار اساسی اصطلاحات ہیں: اسلام، اطاعت خدا و رسولؐ، تقویٰ اور عبادت۔
- یہ کیفیات انسان میں ہمہ تن، ہمہ وقت اور ہمہ وجوہ مطلوب ہیں نہ کہ جز وقتی—— اِلاّ یہ کہ کبھی غفلت کے باعث یہ جذبات کی رَو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات سے مغلوب ہو کر کوئی غلط حرکت سرزد ہو جائے، تو اس پر فوری توبہ اللہ کے یہاں لازماً مقبول ہو گی (النساء: ۱۷)۔ اس کے برعکس اگر جان بوجھ کوئی ایک ''معصیت'' بھی مستقل طور پر اختیار کر لی گئی اور اس پر اصرار ہوا تو اس سے نہ صرف تمام نیکیوں کے ضائع چلے جانے یعنی حبط اعمال کا اندیشہ ہے، بلکہ اس کا بھی خطرہ ہے

کہ ’’المعاصی بریدُ الکفر‘‘ کے مطابق ایمان بالکل زائل ہو جائے اور انسان خُلود فی النّار کا مستحق ہو جائے' اِلَّا یہ کہ حقیقی اور واقعی ’’اضطرار‘‘ موجود ہو!!

(۲) دوسروں کو حتی المقدور اسلام کی تبلیغ کرے اور دین کی دعوت دے!

- اس کے لیے یوں تو بے شمار اصطلاحات ہیں' جیسے انذار' تبشیر' تذکیر' وعظ' نصیحت' وصیت' تعلیم' تبیین' تلقین' وغیرہ' لیکن اہم تر اصطلاحات چار ہی ہیں: (۱) تبلیغ' (۲) دعوت' (۳) امر بالمعروف ونہی عن المنکر' (۴) شہادت علی الناس۔
- یہ خود انسان کی اپنی شرافت و مروت کا تقاضا بھی ہے اور ابنائے نوع کی ہمدردی و خیر خواہی کا تقاضا بھی' لیکن سب سے بڑھ کر یہ سید المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم نبوت کا منطقی نتیجہ ہے کہ اب تا قیامِ قیامت تمام انسانوں پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی جانب سے اتمامِ حجت یعنی ’’شہادت علی الناس‘‘ کی ذمہ داری بحیثیت مجموعی اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کے کندھوں پر ہے!

(۳) وہ اللہ کے کلمے کی سر بلندی اور اُس کے دین حق کے بالفعل قیام اور غلبے کے لیے تن' من' دھن سے کوشاں ہو۔

- اس کے لیے قرآن حکیم کی پانچ اساسی اصطلاحات ہیں: تکبیر رب' اقامت دین' اظہار دینِ الحقّ علی الدّین کُلّہٖ ’’لِیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہ‘‘ اور ’’لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْط‘‘۔
- حدیثِ نبویؐ میں ایک چھٹی اصطلاح وارد ہوئی ہے: ’’لتکون کلمۃُ اللّٰہ ھیَ الْعُلْیَا‘‘ ——— اور
- تین عام فہم تعبیرات ہیں: قیام حکومت الٰہیہ' نفاذ نظام اسلامی' اور اسلامی انقلاب!

متذکرہ بالا تین فرائض کی باہمی نسبت اور اُن کا ایمان اور ارکان اسلام کے ساتھ ربط و تعلق ایک ایسی سہ منزلہ عمارت کی مثال سے خوب واضح ہو جاتا ہے جس کی:

(i) ایک زیر زمین بنیاد ہے جو نظر نہیں آتی لیکن پوری عمارت کی مضبوطی اور پائیداری کا دارومدار اسی پر ہے۔

(ii) اسی بنیاد کا ایک حصہ زمین سے باہر ہے جو نظر آتا ہے' جسے عرفِ عام میں ’’کرسی‘‘ اور انگریزی میں Plinth کہتے ہیں۔

(iii) پہلی منزل پر صرف چار ستون ہیں' دیواریں تعمیر نہیں کی گئیں۔ ظاہر ہے کہ اُوپر کی پوری تعمیر کا وزن ان ہی کے ذریعے بنیاد تک پہنچتا ہے۔

(iv) ان ستونوں پر پہلی چھت قائم ہے۔

(v) دوسری چھت بھی اگرچہ ان ستونوں ہی پر قائم ہے لیکن دیواروں کی تعمیر کے باعث ستون نظر نہیں آتے۔

(vi) اس کے اُوپر تیسری اور آخری چھت ہے اور اُس کا بھی معاملہ یہی ہے!

اس مثال میں: (الف) زیر زمین بنیاد —— ایمان کا ''تصدیقٌ بالقلب'' والا حصہ یعنی یقین قلبی ہے! (ب) بنیاد کا نظر آنے والا حصہ —— ''اقرارٌ باللّسان'' یعنی کلمہ شہادت! (ج) چار ستون چار عبادات کی نمائندگی کرتے ہیں یعنی نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج۔ (د) پہلی چھت اسلام' اطاعت' تقویٰ اور عبادت کی نمائندگی کرتی ہے۔ (ہ) دوسری چھت تبلیغ' دعوت' امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت علی الناس سے عبارت ہے۔ (و) تیسری اور آخری چھت تکبیر رب' اقامت دین' اظہار دین' اعلاء کلمۃ اللہ یا قیام حکومت الٰہیہ کی مظہر ہے! واللہ اعلم!!

● تین لوازم

ان تین اساسی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تین لوازم لابُدَّ منہ ہیں:

(۱) دوام ''جہاد فی سبیل اللہ'' جس کا ظہور:

- فریضہ اوّل کے ضمن میں (i) نفس امّارہ (ii) شیطان لعین اور اس کی ذریت صلبی و معنوی (iii) بگڑے ہوئے معاشرے کے غلط رجحانات اور دباؤ —— کے خلاف جدوجہد اور زور لگانے کی صورت میں ہوتا ہے اور حدیث نبویؐ کی رُو سے یہی افضل الجہاد ہے۔
- فریضہ ثانی کے ضمن میں دعوت و تبلیغ کے لیے جان و مال کھپانے کی صورت میں ہوتا ہے۔
- فریضہ ثالث کے ضمن میں سر دھڑ کی بازی لگانے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر باطل کی قوتوں سے ''بالفعل'' اور ''بالید'' پنجہ آزمائی کی صورت میں ہوتا ہے جس کے لیے تن' من' دھن لگا دینے کا عزم' حتیٰ کہ جان دے دینے کی ''آرزو'' کا ہونا

لازمی ہے!

گویا جہاد کی پہلی منزل مجاہدہ مع النفس اور آخری منزل قتال فی سبیل اللہ ہے!

واضح رہے کہ اسی کا ''منفی پہلو'' ہجرت ہے' چنانچہ اس کی بھی پہلی منزل ''اَنْ تَھْجُرَ مَا کَرِہَ رَبُّکَ'' ہے اور آخری یہ کہ اقامت دین کی جدوجہد میں وقت آنے پر گھر بار' مال ومنال اور اہل وعیال کو چھوڑ کر نکل جایا جائے!

جہاد کی پہلی دو منزلوں کے لیے اصل آلہ وہتھیار قرآن مجید ہے یعنی ''جہاد بالقرآن''۔ چنانچہ مجاہدہ مع النفس کا مؤثر ترین ذریعہ ہے قرآن کے ساتھ قیام اللیل یا تہجد جبکہ دعوت وتبلیغ کا پورا عمل بھی قرآن حکیم ہی کی اساس پر اُسی کے ذریعے ہونا چاہیے!!

تیسری اور آخری منزل پر عہد حاضر میں ''جہاد بالید'' کی موزوں ترین صورت فواحش و منکرات کے خلاف پُرامن مظاہرے ہیں' لیکن اس میں نوبت فقہاء کرام کی طے کردہ شرائط کے تحت قتال یعنی جہاد بالسیف تک بھی آ سکتی ہے۔

(۲) لزومِ اجتماعیت' جس کا تقاضا:

- فریضۂ اوّل کے ضمن میں صرف صحبت صالح (بمصداق: ''کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ'') سے پورا ہوسکتا ہے۔
- اسی طرح فریضۂ ثانی کے ضمن میں درس گاہوں' اداروں' انجمنوں اور سوسائٹیوں سے پورا ہوسکتا ہے!
- لیکن فریضۂ ثالث کے ضمن میں ''سمع وطاعت فی المعروف'' کے ٹھیٹھ اسلامی اور عسکری اصول پر مبنی جماعت کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا' اور یہی مراد ہے آنحضور ﷺ کے ان الفاظ مبارکہ سے کہ: ''آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔'' (رواہ احمد والترمذی عن الحارث الاشعری رضی اللہ عنہ)

(۳) بیعت' جو:

- پہلے دو فرائض کے ضمن میں ''بیعتِ سلوک وارشاد'' کی صورت میں کفایت کرتی ہے' لیکن:
- فریضۂ ثالث کے ضمن میں ''بیعت سمع وطاعت فی المعروف'' کی صورت لازمی و

لابدی ہے! چنانچہ اسی کی جانب اشارہ ہے مسلمؒ کی روایت (عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) میں جس میں آنحضور ﷺ کے یہ الفاظ مبارکہ وارد ہوئے ہیں کہ ''مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً'' اس لیے کہ نارمل حالات میں تو دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

(i) اگر کم سے کم شرائط و معیارات پر اُترنے والا صحیح اسلامی نظامِ حکومت قائم ہے تو اُس کے سربراہ سے بیعت سمع و طاعت فی المعروف ہوگی—— اور (ii) اگر ایسا نہیں ہے تو صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت فی المعروف ہوگی۔ تیسری ممکنہ صورت صرف ایسے عظیم اور شدید فتنے ہی کی ہوسکتی ہے جس میں حدیث نبویؐ میں وارد الفاظ کے مطابق سویا ہوا شخص جاگنے والے سے بہتر ہو' بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہونے والے سے بہتر ہو اور کھڑا رہنے والا شخص چلنے والے سے بہتر ہو!—— اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ!

● نتیجہ

(۱) انجمن خدام القرآن کا مقصد ہے جہاد بالقرآن۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۲ء میں اس کے قیام کے وقت اس کے جو ''اَغراض و مقاصد'' معین ہوئے' وہ یہ تھے: (i) عربی زبان کی تعلیم و ترویج (ii) قرآن مجید کے مطالعہ کی عام ترغیب و تشویق (iii) علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت (iv) ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم و تربیت جو تعلیم و تعلّم قرآن کو مقصد زندگی بنالیں—— اور (v) ایک ایسی قرآن اکیڈمی کا قیام جو قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کرسکے۔

(۲) تنظیم اسلامی ہے جملہ دینی فرائض کی انجام دہی بالخصوص اقامت دین یا اسلامی انقلاب کے لیے ''بیعت ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ و سمع و طاعت فی المعروف'' پر مبنی خالص دینی جماعت!!

۞۞۞

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تا کہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ - اور - غلبہ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**